گلشن ہند

مشہور شعراے اُردو کا ایک تذکرہ

جس کو

میرزا علی متخلص بہ لطف

نے بعہد مارکوئس آوف ویلزلی گورنر جنرل ہند، اُردو کے مشہور سرپرست مسٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش سے 'علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرہ گلزار ابراہیم سے' مع اضافوں کے اُردو زبان میں' جو آج سے ایک سو پانچ برس پیشتر کی سادہ اُردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے'

سنہ ۱۸۰۱ء

میں تصنیف کیا، اور

سنہ ۱۹۰۶ء

میں

شمس العلما مولوی شبلی کی تصحیح تحشیہ اور مولوی عبدالحق صاحب بی. اے کے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ، اُردو زبان کی خدمت کے لئے

عبداللہ خاں نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا

اور

دارالاشاعت پنجاب

کے

رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور میں چھپا

Acc. No 6816

ڈیڈی کیشن

ہز ایکسلنسی مہاراجہ یمین السلطنت
بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ کو چوں کہ
اُردو زبان سے ایک خاص دلچسپی ہے
اور آپ خود بھی اُردو زبان کے ایک
ممتاز مصنّف اور بلند پایہ شاعر ہیں،
لہذا یہ کتاب جناب کے نام نامی پر
ڈیڈیکیٹ کی جاتی ہے ؛

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

خاکسار
عبداللہ خاں حیدر آباد دکن

مضامین	نمبر صفحہ
دیوانہ، رائے سرب سنگھ	۱۰۲
باب السین	۱۰۳
سودا، میرزا محمد رفیع	۱۰۳
سوز، سید میر	۱۱۳
سجاد، میر سجاد	۱۱۹
باب الشین	۱۲۱
شورش، میر غلام حسین	۱۲۱
باب الصاد	۱۲۲
صانع، نظام الدین	۱۲۲
باب الضاد	۱۲۳
ضیا، میر ضیاء الدین	۱۲۳
باب العین	۱۲۴
عزلت، سید عبدالولی	۱۲۴
عشق، شاہ رکن الدین	۱۲۶
عیش، میرزا عسکری	۱۲۷
باب الفاء	۱۲۸
فقیر، میر شمس الدین	۱۲۸
فغاں، اشرف علی خاں	۱۳۰
فرحت، شیخ فرحت اللہ	۱۳۱
فدوی، میرزا محمد علی	۱۳۲
باب القاف	۱۳۳
قائم، شیخ محمد قائم	۱۳۳
قدرت، شاہ قدرت اللہ	۱۳۸
باب الکاف	۱۴۴

مضامین	نمبر صفحہ
کلیم، شیخ محمد حسین	۱۴۵
باب اللام	۱۴۶
لطف، میرزا علی، مصنف تذکرہ ہند	۱۴۶
باب المیم	۱۵۲
میر، میر محمد تقی	۱۵۲
مظہر، میرزا جان جاناں	۱۵۹
مضموں، شیخ شرف الدین	۱۶۰
مخلص، مخلص علی خاں	۱۶۲
مجذوب، میر غلام حیدر	۱۶۵
مصحفی، غلام ہمدانی	۱۶۵
محبت، نواب محبت خاں	۱۶۶
منت، میر قمر الدین	۱۷۱
باب النون	۱۷۳
ناجی، محمد شاکر	۱۷۳
نعیم، نعیم اللہ	۱۷۵
باب الواو	۱۷۵
ولی، شاہ ولی اللہ دکنی	۱۷۵
ولی، میرزا محمد ولی	۱۷۹
باب الہاء	۱۸۰
ہدایت، شیخ ہدایت اللہ	۱۸۰
باب الیاء	۱۸۲
یقین، انعام اللہ خاں	۱۸۲
یکرنگ، مصطفیٰ قلی خاں	۱۹۵

پبلشر کی التماس

سنہ ۱۳۲۶ ہجری کے موسم برسات میں پایۂ تخت حیدرآباد کی مشہور ندی میں، جو حصار شہر کے نیچے بہتی چلی گئی ہے، ایک عظیم الشان سیلاب آیا۔ اس سیلاب سے لاکھوں روپے کا نقصان ہوا، اور کچھ لوگوں کو بہ مصداق "چوں خراب شود خانۂ خدا گردد" فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن اس طوفان کی سب سے بڑی اور مفید یادگار یہ تذکرہ ہے، جو پبلک میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر سیلاب نہ آتا تو اس منحوس زمین سے اس علمی چشمے کا بہنا ممکن نہ تھا۔ یہ سیلاب جہاں اور ہزاروں چیزوں کو اپنے ساتھ لایا، وہاں کسی آفت زدہ کا ایک کتب خانہ بھی بہا لایا، اور اس میں یہ تذکرہ بھی تھا۔ پبلک میں یہ آب آوردہ کتابیں کوڑیوں کے داموں بکیں، اور یہ تذکرہ ہمارے کرم فرما، مولوی غلام محمد صاحب مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھ لگا، انہوں نے علامہ شبلی کو دکھایا۔ علامہ موصوف نے اس کو بدرجۂ غایت پسند کیا، اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا، لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے اس کو نہ چھاپ سکی۔ اور علامہ موصوف نے ہم کو اس کے شائع کرنے کی رائے دی اور خود اس کے اڈٹ کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ علامہ موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی، اور اس پر کچھ نوٹ بھی لگائے، جو بجنسہ چھاپ دیئے گئے ہیں۔

اس تذکرے کی معنوی خوبیاں، اور تاریخی حیثیت سے اس کی اہمیت، اس مقدمے سے ظاہر ہوگی جو ہمارے کرم فرما مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے، پرنسپل مدرسہ آصفیہ حیدرآباد نے ہماری فرمائش سے اس تذکرے پر لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے اردو زبان کی نشو و نما کی تاریخ اور اس کی قدیم تصانیف کا بیان اور تذکرہ ہذا کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو ریویو لکھنے میں جو خاص ملکہ ہے، اس کو تمام اردو داں پبلک جانتی ہے، کہ وہ کس خوبی سے اس اہم کام کو انجام دیتے ہیں، اس لئے ہم بجز شکریہ کے اور زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

مقدمہ

بر تذکرۂ گلشن ہند

(از مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے۔ پرنسپل مدرسہ آصفیہ۔ حیدرآباد دکن۔)

یہ کتاب شعرائے اردو کا قابل قدر و نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت شخص[1] کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا، اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمایش کی۔ میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمایش کو جو انہوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا، اور بسر و چشم قبول کیا۔

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد، اور امیر الممالک لارڈ وارن ہیسٹنگز، گورنر جنرل کے زمانے میں، علی ابراہیم خاں[2] نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی

[1] مولوی عبد اللہ خان صاحب کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن۔ [2] ابراہیم خاں، متخلص بہ خلیل، مشہور ادیب اور مورخ ہیں۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے بعہد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس، بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور جج مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۲۰۸ ہجری میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:

(۱) گلزار ابراہیم، تذکرہ شعرائے اردو، جو شاہ عالم کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہیسٹنگز کی گورنر جنرلی میں ۱۱۹۶ھ میں لکھا ہے، اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے اس تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد رکھی۔

(۲) خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم، یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں۔

(۳) وقائع جنگ مرہٹہ، یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس سنہ ۱۲۰۱ ہجری میں لکھی گئی تھی۔ اس میں سنہ ۱۱۷۱ھ سے سنہ ۱۱۹۴ھ تک کے حالات درج ہیں۔ [illegible] نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں، اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے سن کر لکھا گیا ہے جس نے اپنی آنکھوں سے یہ جنگ دیکھی تھی۔

(۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانے کا ہے، مگر چونکہ اس کتاب کے شروع ہی میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "من کہ علی ابراہیم خاں بہ انتظام خواہان کمپنی انگریز" لہٰذا کسی قسم کی بدگمانی ہوتی ہے۔

(۵) خطوط، جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اور جن سے اس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

ہمیں مولوی غلام محمد صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، جنہوں نے اپنی علمی فیاضی سے، یہ کتاب ہم کو چھاپنے کے لئے دی اور کئی سال تک ہمارے پاس رہی۔ علامہ شبلی بھی خاص شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی عنایت سے اس کی تصحیح اور تحشی میں اپنا وقت صرف کیا ۔

اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے ۔ البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونہ کلام، جو اس تذکرے میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا، اس میں سے صرف عمدہ نمونہ چن لیا گیا ہے، اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوق سلیم نے انجام دیا ہے۔ اس کے سوا اس میں اور کوئی تصرف نہیں کیا گیا بلکہ مقدمے اور نوٹوں سے اس کو اور زیادہ مخزن معلومات بنایا گیا ہے۔ جس کی قدردانی کی پبلک سے امید کی جاتی ہے۔ اگر پبلک نے اس کی قدردانی کی تو ہم بہت جلد اور مفید علمی کتابوں کے شائع کرنے کے قابل ہو سکیں گے جو انگریزی اور عربی سے ترجمہ کی گئی ہیں ۔

عبداللہ خاں

کتب خانہ آصفیہ
حیدرآباد دکن
۱۶ ؍ نومبر ۱۹۰۶ء

میں لکھا تھا، اور اس کا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ھ ہجری مطابق ۱۷۸۴ء عیسوی میں جا کر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اُردو کے بڑے قدردان اور محسن، مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گزرا۔ انہوں نے مؤلف تذکرۂ ہذا سے فرمائش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اُردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اُن کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں، اور اُن میں اُردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نرا ترجمہ ہے، بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے +

یہ تالیف اُس زمانے میں ہوئی جب کہ دلّی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں رونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بے بسی اور بے کسی کی حالت میں تھے، اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلّی کے اہل کمال اپنے وطن سے مُنہ موڑ اُسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے، قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے۔ سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر کے اساتذہ جو پہنچے تو اُنہوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب رنگ پھیکے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں جیسا عالی دماغ، متین، منتظم، اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاء اللہ خاں نے جو ہزار پھکڑوں کا ایک پھکڑ تھا، آخر انہیں اپنی گوں نہ دیکھ کر کہہ ہی دیا۔

"میں ہوں ہنسنے کو تو ہے متعلق میرا تیرا میل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اُردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشک، لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رُخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی تھی اور صاف اور شستہ ہوتی جاتی تھی، اور زوال اس لئے کہ فن شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص۔ اس کے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لئے۔ شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے، قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا

ایک آدھ محاورہ آگیا، کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہ دی، کبھی کبھار ڈھونڈتے ڈھونڈتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہو گیا! رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی، اور اب بھی وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقرر ہیں، اور یا جو ایک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے، کیوں کہ نکتہ سنج شاعر اس کے لئے سند طلب کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعراء کی محنت سے زبان صاف ہوگئی، لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھٹھر کے رہ گئی، اور جو حصار کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شاعری کا دعویٰ ہے، اردو کے اُستاد ہیں۔ مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں، دیوان اردو ہے، مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اردو میں نہیں، کسی طبیب کے پاس جایئے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک رائج ہے)، سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے، یہاں تک کہ خط کی مشق کے لئے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی، اب اردو کو وسعت ہو تو کیوں کر ہو۔

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی، اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا، جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے، اس نے اردو کی دستگیری کی۔ اردو اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اُس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار باقی تھے، اسی کا دور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آتی۔ اس لئے انہوں نے اس کی سرپرستی کی۔ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں، بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قایم کیا، جس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں، ان کی

تعلیم کے لئے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں۔ اور غالباً اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی۔ یہ عجب واقعہ ہے، اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی۔ اور دوسرے دور میں اردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے۔ اور مختلف کتابیں لکھوائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا، اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جو احسان وَلی نے اردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلکرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ہے ●

چوں کہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا، لہٰذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا کہ اس کی نگرانی میں، یا اَور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا، اور اُردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا، نامناسب نہ ہوگا ●

اس سلسلے میں سب سے اول سید محمد حیدر بخش حیدری قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے سنہ ۱۸۰۱ عیسوی میں توتا کہانی لکھی، جو اصل میں انہوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانے میں، دکنی زبان میں لکھا تھا، مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرایش محفل یعنی مشہور قصۂ حاتم بھی جو اب تک عوام میں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے، انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گل مغفرت یا دہ مجلس مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے۔ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے جس کا نام گلزار دانش ہے۔ ایک اَور کتاب تاریخ نادری اُردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے ●

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں انہوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اُردو نثر میں کیا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے۔ اور ایک اَور کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب

ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں سنہ ۱۸۰۳ء میں لکھی گئی تھیں۔

میر امن دہلوی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ احمد شاہ درانی کے زمانے میں جو دلی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آ رہے۔ پھر یہاں سے سنہ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ باغ و بہار کی وجہ سے کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۰۱-۲ء میں لکھی گئی ہے۔ اور انیسویں صدی کے آغاز کی جو زبان تھی اس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش ہے میر امن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب تحسین نامی ساکن اٹاوہ نے اسے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا، اور اس کا نام نو طرز مرصع رکھا تھا۔ میر امن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانے میں لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے سنہ ۱۸۰۳ء میں انہوں نے علامی ابو الفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اردو میں کیا اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے، اور عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔

میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے، اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم و عالمیان مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے متوسل ہو گئے۔ مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہجہان آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ تلمذ ان کو میر حیدر علی حیران سے ہے، اور بعض کا قول ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان، بارلو صاحب نے، مسٹر گلکرسٹ کے مشورے سے، زباں دانان ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا، چناں چہ لکھنؤ کے رزیڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا، اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر کے پانسو روپے خرچ راہ دیا، اور کلکتہ روانہ کیا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے، اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انہوں نے

ایک قابل قدر کتاب آرائش محفل لکھی، جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ سبحان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے، اور مرنے سے سال بھر پہلے یعنی سنہ ۱۸۰۲ء میں سعدی کی گلستاں کا ترجمہ باغ اُردو کے نام سے اُردو میں کیا۔

نہال چند نے سنہ ۱۸۰۳ء میں مثنوی گل بکاولی کو اُردو نثر میں لکھا، اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوان بھی دہلی کے تھے، بعد ازاں لکھنؤ میں آئے، اور وہاں سے سنہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ انھوں نے سنہ ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا۔ نواز کبیشر نے جو برج بھاکا میں (سنہ ۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی، اس کا یہ ترجمہ ہے۔ انھوں نے ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے، اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تہواروں کا ذکر ہے، جس کا نام دستور ہند ہے، اور جو سنہ ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے سنہ ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا، جس میں شاہ اجنہ کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا پیش ہے، کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے۔ یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے۔

سری لالو گجرات کا برہمن تھا، جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں، مثلاً پریم ساگر، راج نیتی، و لطائف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری لالو اور جوان نے مل کر سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے۔ اور مرزا لطف علی کی مدد سے قصہ مادھونل کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اس کے خود گلکرسٹ نے سنہ ۱۸۰۰ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی، زبان کے بعض قواعد لکھے، اور مختلف طرح سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ سے اول بھی

ایک شخص فرگسن نامی نے اردو کی ایک لغت لکھی تھی جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی۔ مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی، جرجن ولیم کرک پیٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا، جس کے انہوں نے تین حصے کئے، مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اس حصے میں انہوں نے وہ الفاظ دئے جو فارسی سے ہندی میں آ گئے ہیں۔ باقی دو حصوں کے طبع کرنے کے لئے انہیں نا گری ہر تھا، وہ جلد تیار نہ ہو سکا، اور کتاب ناقص رہ گئی۔ یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلکرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں، مگر چوں کہ ان کو اور بہت سے کام کرنے تھے، اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہو گئے، اور ڈاکٹر گلکرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۶ء میں چھاپ دیا، مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے۔ علاوہ اُن تمام دقتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے، ایک دقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے۔ صرف ستر صاحبوں نے خریداری منظور کی۔ حالاں کہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ و کمانڈنٹ ملٹری ایکاڈمی نے اردو لغت لکھنی شروع کی، مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا، اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی امداد سے نظر ثانی کر کے چھپوایا۔

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی، جو کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شیکسپیر نے ایک اردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی، یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۷ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی

برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی، جو پیرس میں ۱۸۶۴ء میں طبع ہوئی۔ براؤن کی لغت ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی۔ پلیٹ نے بھی ایک لغت لکھی ہے، جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اردو کی کئی لغات لکھیں، ان کی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے، یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو دو ایک لغت لکھے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس مقدمے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی، اور اس کی ترقی دینے میں انہوں نے حتی الامکان کوشش کی۔

میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے، اور وہ بہت اسی تذکرے سے لیا ہے۔ میر کے حال میں لکھا ہے:-

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زباں دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بچارے مجبول کے محمول ہوئے، اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا درخواست خالی ہے۔"

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا، کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا! چوں کہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ موجود ہے اس لئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جا کر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان ان کی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے، اور اردو زبان میں ایک عجیب اور قابل قدر اضافہ ہوتا۔

نواب محبت خاں محبت، خلف الرشید نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں، کے ذکر میں لکھا ہے کہ-

"انہوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی فرمایش سے قصہ سسی پنوں کا اُردو میں نظم کیا اور نام اس کا اسرار محبت رکھا۔"

میر قمر الدین کے حال میں درج ہے کہ۔

"انہوں نے میر محمد حسین ۔ فرنگی لقب، کے توسل سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین کی سرکار میں توسل حاصل کیا، اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہشتین (ہیسٹنگز) جلادت جنگ بہادر بانت سے پیشگاہ نظامت صوبہ بنگ سے ملک الشعرا کا خطاب لیا۔"

اس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کرنل ہال رائیڈ سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اُردو زبان کی ترقی میں بیش بہا مدد دی۔ سلسلہ تعلیم کے لئے عمدہ عمدہ کتابیں لکھوائیں، انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں، اور اس میں مفید اور نیک مشورہ دیا۔ کتابت اور چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا، اور اس میں کارآمد اصلاحیں کیں۔ اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قایم کی جس میں نیچرل مضامین پر عمدہ عمدہ نظمیں لکھوائیں شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی، اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انہیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہالرائیڈ کا یہ کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نثر کی طرح اُردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر ہل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اُردو کی صدارت قبول فرما کر اُردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں۔ اسی سلسلے میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہے، اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سب سے اول اُردو کتابیں بھی انہوں ہی نے چھپوائیں۔ اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اُردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں، اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلکرسٹ، اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں اس کے بعد لیتھو گراف پریس سب سے پہلے دہلی میں سنہ ۱۸۳۷ء میں، استعمال ہوا۔

اور اس کے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی +

وہ انگریز حاکم، جس نے اس ملک میں بیٹھ کر جو اردو کا جنم بھوم اور وطن مالوفہ ہے، اسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہتا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا۔ اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا، اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں، اور اس عجیب وغریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب غریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے، اس پر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے، ہند اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں، اور انگریز اس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو تینوں کے اتحاد کی یادگار رہے۔ وہ غلطی پر ہیں، جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قائم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قایم رہے گی +

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے۔ دیباچے میں تو ذکر ہی نہیں، شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے، بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور ناکافی ہے، البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے، اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ ادھر ادھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے +

نام میرزا علی تخلص لطف تھا، ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے، سنہ ۱۱۵۱ ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہان آباد تشریف لائے، اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا، فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں:

سنہ ۱۲۱۵ھ میں حیدرآباد کا تھا مگر جب کہ مسٹر گلکرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس

"تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہٰذا میں نے اسے بسر و چشم قبول کیا"[1]

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہجری اور ۱۸۰۱ء کے ہیں اس عہد سلطنت قایم ہے، اسی بادشاہ دشمن

دل خیر پرست سے ....."

پھر اس کے بعد نواب سعادت علی خاں بہادر کا ذکر کیا ہے، اور بعد ازاں مارکوئیس آف ولزلی

کے متعلق یہ لکھتے ہیں:-

"موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہو چکا ہے، اس

ذیچہ من نے یہ تذکرہ لکھا"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ مؤلف نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا، اس کے مادہ

تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۵ ہجری میں لکھی گئی۔

"حیران پھریں ہیں بے سر و پا بہمن اور دے

تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے"

۱۲ - ۱۲۲۶ = ۱۲۱۵ ہجری

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمایش کے بعد نہیں، تو اول ضرور حیدر آباد

میں تشریف رکھتے تھے، کیوں کہ ان کے کلام میں وہ قصاید درج ہیں جو انہوں نے اعظم الامرا

ارسطو جاہ، اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے۔ اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے

کے بعد دوبارہ ۱۷۹۷ء میں وزیر مقرر ہوئے، اور مئی ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد

اسی سال میر عالم وزیر ہوئے، اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ مؤلف اس زمانے میں حیدر آباد چلے گئے تھے۔ چوں کہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے

سابقہ رہا ہے، یا اہل حیدر آباد سے، اس لئے انہوں نے ایک شعر میں اس متعلق کو بڑی خوبی

---

[1] ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۲

سے ادا کیا ہے، کہتے ہیں:۔

"ہوا آوارہ ہندستاں سے لطفؔ آگے خدا جانے"
"دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے"

جو قصیدہ اُنھوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی وہ فراغ بال اور خوش حال تھے، اور دکن میں جا کر ارسطو جاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے، مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے، اضافے کی درخواست بھی اور بڑے زور سے کرتے ہیں:۔

کل ہی کی بات ہے، یہ مسافر وطن میں تھا
سو وہ سو آشنا کا حقِ بندگی گزار

شکرِ خدا، کہ آج بیک بینی و دو گوش
گرچہ دکن میں ہے، نہیں ہر شے پہ لو و نار

ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکوں
لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار

اس سامعہ خراشی سے مجھ کو ہے یہ ظن
سو یہ ہے، اے امیرِ فلک قدر و کے تبار

سرکار سے تری جو زراہِ تفضلات
ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

ہر چند جائے شکر ہے، پر عرض کیا کروں
جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل و نہار

ہے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے
ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار

متعلقِ خدا کا بار اُٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

باقی جو سو ہے، کئی دن میں زباں پہ ہم
مثلِ مجردات نقصان کا ہے شمار

سمجھا ہو قدردانِ نکات، اور یہ نکتہ سنج
یوں ہو اسیر پنجۂ چرخِ ستم شعار

فضل و ہنر جو مجھ میں ہے وہ مثبت یک طرف
اور قدردانیاں بھی تری سب یہ یک کنار

ہے ہمتِ بلند کا تیری جو اقتضا
اس امر میں تو ہے تجھے آئندہ اختیار

از بس کہ کم دماغ ہوں ضیقِ معاش سے
بالفعل تو اضافے کا ہوں گا امیدوار

لیکن نہ وہ اضافہ جو ہو میرے برائے نام
کہ فرض ہوں سو پچاس میں گر ہو کشود کار

تصنیف میں چاہتا ہے تجھ سے ضعیف	کیوں کر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بلہا
غالب ہے تجھ پہ شاق نہ ہوں تیرے تین سو	پھر سو جب اُنیوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں قدیم سے چلی آرہی ہے، اور اب تک باقی ہے +

علاوہ اس قصیدے میں شاعر نے تعلّی کی لی ہے، اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں نے وہ پہلے اس نے قصیدہ کہا اور صرف اس کے اس مطلع پر +

"اے شان حیدری زجبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار"

امیر الامراء نے زر و سیم نثار کیا۔ پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اس میں کیا رکھا ہے:۔

"غیر نقطِ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات — ایسی کہ ڈال دیویں سر جس کے آگے یار
آئینِ قدر دانی میں لیکن برائے نام — انعام ہی سے گیا جو خانِ باوقار"

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے:۔

"کہتی ہے فارسی میں بھی ملق مطلعے — ہاں در جواب مطلع ناصر علی بیار
اے ذرہ ہا ز نامِ تو خورشید اعتبار — تاثیر اسم اعظم از اسم تو آشکار"

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا +

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں بھی یہی رونا رویا ہے،

"پر اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہے تجھ سے — کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس وطبل و لشکر کا
توجہ اتنی فرما تو کہ اِ یحتاج کی رو سے — نہ ہوں محتاج عندالوقت سیم و زر و گوہر کا"

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اپنے تذکرہ شعرا گلشن بیخار میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میرزا لطف کچھ دنوں نواحِ عظیم آباد میں بھی رہے ہیں، اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں۔"

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں یہ لکھتے ہیں:-

"اور شعور ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے"

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مداح اور ملنے والے ہیں، اور غالباً اسی وجہ سے وہ ان کی شاگردی سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے، مگر کلام میں لطف نہیں ہے البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو اردو زبان میں قابل یادگار ہے۔ چوں کہ انگریز با اقتدار کی فرمائش سے لکھا ہے، زبان صاف اور سادہ ہے، تاہم قافیے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اگرچہ اور بھی لکھے گئے ہیں، مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے۔

۱۔ اوّل تو سو برس پہلے کی زبان ہے، جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے، اور محقق علم اللسان کو، اور نیز اُن لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے، بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے، کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرّہ بول چال میں آتے ہیں، اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً "کرکے" کا خاص استعمال، جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں۔ اس تذکرے میں بھی جا بجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:-

"شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر بھنا کرکے تھے۔"

اسی طرح میر قمر الدین منت کے حال میں لکھا ہے:-

"چنانچہ شکرستان کرکے، ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے"

دکن میں بعض لوگ "بعد میں" کی جگہ "بعد از" بولتے ہیں، سودا نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے:-

"ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا   رہے گا مرگ کے 'بعد از' مزار میں رونا"

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں۔ مثلاً فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے، مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں۔ منیا کے حال میں لکھا ہے۔

"مدتی سے جبکہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا دہیں ٹھیرے"

فقیر کے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

"پھر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے"

دکن میں عام طور پر "میں کہا" بولتے ہیں، قایم کہتے ہیں:۔

"میں کہا" عہد کیا کیا تھا رات،

"ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں"

۲۔ دوسرے علاوہ اس کے کہ مؤلف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اردو زبان عروج پر تھی، اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے، مولف ان کا ہم عصر تھا، اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی اور دوستی تھی، اور اس لئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ ان کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لئے طلب کرنا، اور بوجہ پیرانہ سالی ان کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے، اور جو صرف اس تذکرے کا مؤلف ہی لکھ سکتا تھا، کیوں کہ وہ ان کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا۔ علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو انہوں نے عمر بھر نباہی۔ وہ لکھتا ہے۔

"ناقدردانی سے اغنیا کی، اور تباہی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوائے شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد ہے کہ میر سا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی

"بیان میں معانی پروانے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی رنج ہے"۔

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:-

"جب میر صاحب لکھنؤ گئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا، مگر چونکہ بد مزاج بہت تھے

نواب سے بگاڑ کر لیا، اور گھر بیٹھ رہے، اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی"۔

مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ:-

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا، اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے تحسین

ناظر کے سپرد کر دیا، اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی بعد چندے صحبت نواب مرحوم سے بگڑ گئی، لیکن تنخواہ میں

قصور نہ ہوا، اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج کے دن تک، کہ ۱۲۲۱ھ ہجری ہیں، وہی حال

ہے جو اوپر مذکور ہوا"۔

مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ لکھنا کہ وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے، یا یہ ہے کہ وہ

دوسروں کے مقابلے میں اُن کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ بعض باتیں اس میں نئی

نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے، صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے، کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت

یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہے، ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔

چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں ان کا بزمانہ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے

دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا، اور ان کا ۱۱۷۳ھ ہجری

میں تخت نشین ہونا، رام نرائن سے جنگ، دلیر خاں کی دلیری اور جان نثاری، فتح و نصرت

کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ، بالتفصیل لکھا ہے۔ اور اخیر میں کور نمک سنگدل غلام قادر خاں روہیلے

کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے؛ اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہے، جس میں یہ

واقعہ منظوم ہے، اور خود اُردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج کی ہے، اس لئے کہ تذکرہ اُردو کا ہے،

اور اصل غزل حاشیے پر لکھ دی ہے؛ البتہ اتنا تکلف کیا ہے۔ اسی طرح تاناشاہ، آصف الدولہ اور

مرزا محمد رضا اُمید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں۔ خصوصاً میرزا محمد رضا اُمید کے تذکرے میں "امیر الامرا حسین علی خاں" اور ان کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔ ہم چوتھے اس کتاب سے زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے "اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے، کہ ہمارے شاعروں کا گروہ بے فکرا تھا، اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اخیر میں جب ہمارے بادشاہ نواب اور امرا اس طرف جھکے، تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ ان لوگوں نے رہا سہا انہیں ، ور ڈبو دیا۔ مُلک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ جسمانی اور دماغی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر شاعری نے اس کا سامان اَور مہیا کر دیا، دیوانہ را ہوئے بس است، شاعروں کی بن آئی، وہ تو اس شغل میں رہے، اور یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے، بڑے بوڑھے نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے، باکمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے، اور دھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے، اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے جو شعرا کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی، کسی اُستاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے، اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے۔ میں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہو گی؟

علاوہ اس عام حالت کے، تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک واقعہ، جس کا مجھ پر بھی اثر ہوا، یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اس زمانے میں جب کہ ان کا عروج اقبال تھا، اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، تب بھی شاہان دہلی اور ان کے

گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل کے نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ ہجری میں دلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔

"نواب آصف الدولہ موصوف، جو مراتب آداب و خدمت گزاری کے تھے، سب ادا کئے، خواصی میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے، باوصف اس نازبرداری کے کہ کبھی پیادہ قدم کا ہے کو چلے تھے پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک بالکی اور گھوڑی کی آگے پیدل دس دس مرتبہ بجز نگاہ پر سے جا کر آداب بجا لائے۔"

۵۔ پانچویں، بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جن کی نسبت اردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اردو کے شاعر تھے۔ اور ان کا تخلص اشتیاق تھا یا عبد القادر بیدل بھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے، جو آدھا اردو اور آدھا ہندی ہے۔ بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:-

"ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ اتفاق پڑا؛ چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے، اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی، اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔ میں نے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی، لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں۔"

حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اس مثنوی کا وہ حصہ جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو ہے۔ میر حسن کے حالات میں نقل کر دیا ہے۔ ناظرین کو لکھنؤ کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا۔

"زبس کو تہ سے یہ شہر ہم عد سے ہے   اگر شیعہ کہئے نیک اس کو بد ہے"

اس مثنوی کا نام غالباً گلزار ارم تھا۔ میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے: "درحقیقت کلام سب اچھا ہے، مگر افسوس آج کل نہیں ملتا۔"

خواجہ میر درد کے بھائی میاں سید محمد میر اثر کی مثنوی خواب و خیال اب تک سنی ہی سنی تھی، اس کے

چند شعرائے حالات میں بیچ میں شمس العلما مولوی شبلی نے ایک مفصل ذیل نوٹ لکھا ہے[۱]، جو کتاب کے صفحہ ۳۴ پر درج ہے:

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی توجیہ یہ فرمائی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں، کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے۔"

ہمیں تعجب ہے، کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے، حالاں کہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بیحد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ "لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے" بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر و انیس میں انہیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے، حالاں کہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر، یا اُردو شاعری کے نشو و نما اور اُس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آگیا ہے، اور اس میں دلی لکھنؤ والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یا دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے، وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اُردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، جو صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں، تو لوگوں کے عام، (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا، اور وہ بت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے، یکایک متزلزل ہو گئے، اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا نے اس کی

---

[۱] شمس العلما مولوی شبلی نے از راہ نوازش اس تذکرہ پر جا بجا نوٹ تحریر فرمائے ہیں۔

خواہ مخواہ اس لئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اُس رتبے کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اُسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو اُلٹی یہ شکایت ہے کہ مولٰنا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جو اگرچہ صریح اور بیّن ہیں، مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اُس کی پوری قلعی کھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں، مولٰنا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف اتنا کہ انہوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہہ دیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

اول تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں، چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں لکھتا ہے:۔

"مثنوی بحیثیان شہرت تمام دارد کہ بناسے آں برمحاورہ بحت است، واین بہت مرغوب علم"

مولوی محمد حسین آزاد آب حیات میں کہتے ہیں کہ:۔

"ایک مثنوی خواب و خیال ان کی مشہور ہے، اور بہت اچھی لکھی ہے"

دوسرے ان کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں درد، زبان کی صفائی، شستگی اور لطافت بدرجۂ کمال موجود ہے؛ اور یہ سب باتیں مثنوی کے لئے خاص طور پر مناسب ہیں۔ مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے، کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا سراپا کا مضمون اس قدر مبتذل ہے کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا، یا اس میں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا بہت مشکل ہے۔ اور چوں کہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے، اس لئے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہے۔ صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی ایک آدھ جگہ دیا ہے؛ مثلاً جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کی تعریف کی ہے، لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہے کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اچھا شاعر ہے لیکن اس کا کیا جواب ہے، کہ جو شعر خواجہ اثر کا بہ تبدیل لفظ شوق نے اپنا کر لیا ہے، یعنی:۔

اثر — ہاتھا پائی میں ہا نپتے جانا — کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

شوق ـ ـ ـ ماما پانی میں ما نپتے جانا   چھوٹے کپڑوں کو دُھا نپتے جانا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا ان کے بعد نواب میرزا شوق، اگر یہ شعر ان کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے، کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہے، تو اس طرز کا اثر ضرور اس پر پڑا ہوگا۔ مولنا حالی فرماتے ہیں :۔

"خواب وخیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں"

یہ ایک مزید ثبوت ہے۔

دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ وہ مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی جب کہ اردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی۔ باوجود اس کے مولنا حالی نے صاف لکھ دیا ہے :۔

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب وخیال کو بہار عشق سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی"

اخیر اس میں تو ظاہرا ایک حد تک کچھ گنجائش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولنا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالہ سری رام صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں۔ اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے۔ ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور اس بحث کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں موقع آپڑا تھا اس لئے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

۶۔ چھٹے، صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں؛ جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے؛ مثلاً: شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسنین اور جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ ان کی تصانیف سے ہیں"

حالاں کہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے، نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے، یہ محض اتہام ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر کہ یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے "خوب ہجو ملیح کی ہے"؛ اور آخر میں یہ لکھا ہے :۔

"کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے، فی الواقع لائق فرزند باپ کے عالی مقصد ہی ہوتے ہیں۔ سونا جلاؤں کے بانکا ہے۔ بقول شاعر کہ

تیر لے نیچے میں فرش شیرے واضح ہے بھونکیں کہتے ہیں لی پی باگی موجود ہے"

یا مظہر جانِ جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

"۱۱۹۴ھ ہجری تھے کہ اس روشن ساز مسائل صدیقی نے، اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے، اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا"

یا تانا شاہ کے حالات میں مؤلف عالمگیر کی نسبت یوں گوہر فشانی کرتا ہے کہ:۔

"خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظالم اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا نتیجہ ہو"

مکہ مسجد کا کھدوانا زا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مولف نے جو خود حیدر آباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا کیوں کر گوارا کیا ہمیں شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں۔ کہ مکہ مسجد موجود ہے اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگزر نہیں کرتا، مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں ان کی داد و دہش اور مروت کی بے انتہا ستائش کی ہے، لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے۔

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی، تابعوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا، ہمیشہ کوئی وقت اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا"

یا سراج الدین علی خاں آرزو نے، جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے، اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے نہیں صاف نزاع معلوم ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے"

اس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلی کے تھے۔ دلی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اردو نے اس میں جنم لیا، وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے، زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلائق رہا، کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دہانی، کبھی سلاطین

اسلام کا دارالخلافت کبھی طغیانی کی بدولت بہ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا؛ کبھی معرکۂ جنگ و جدل و قتل عام ہے، اور کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے؛ کبھی تخت گاہ شاہان اور مرجع کمال ہے، اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لشکر سے خاصہ کھنڈر ہے؛ کبھی مورد بلیات و آفات ہے، اور کبھی منزل حسنات و برکات؛ غرض یہ نگری یوں ہیں اجڑتی اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی؛ مگر باوجود اس کے اس کے حسن عالم فروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی، اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی لیکن اخیر زمانے میں جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہو گئیں، تو وہ ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا۔ سب سے اول نادر شاہ کا ایسا تھپیڑا لگا، کہ اس سے بیٹھا ہی تو دیا۔ اس کے ستر برس بعد ہی احمد شاہ ابدالی کی چڑھائی ہوئی، پھر مرہٹوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا۔ اب تک جو با کمال دلی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے۔ سوا ایک میر درد کے جن کی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں

"جس ایام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا اور ہر ایک کوچہ اس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے، اور بکثرت متمکنان عدیم المثال تھے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا؛ تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع مسکون کا تنگ، اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث، اور مکرر ورود بلیات کے سبب خراب ہوا، اور معمورۂ عقوبت معذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صاحب بناہ گزین نے اور ہر ایک توانگر مالدار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگ کے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وحید الاعصار، کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمان استقلال نے خیال ہی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے، اور حامل جفاؤں کے ہوئے؛ اور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے"

ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کی ٹیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اجڑنے کے بعد لکھنو آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں اس کا ساتھ دیا، اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا؛ آصف الدولہ سا لکھ لٹ نواب تھا، اہل کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو تھا وہیں پہنچا، اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خان آرزو پہنچے، اس کے بعد سودا تشریف لے گئے؛ سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے سنہ ۱۱۹۲ھ میں دلی سے لکھنو کو حرکت فرمایا

میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہوگئی، اور میر حسن، میر سوز، جرأت، سب لکھنؤ میں جا بسے، اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آگئی، اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی، اب یہاں لکھنؤ کی سوسائٹی کا اردو زبان اور اردو شاعری پر کیا اثر ہوا، یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔
مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خاں کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہوگی اور کم سے کم اس قصے کی تحقیق ہو جائے گی جو شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے، مگر یہ تذکرہ سنہ ۱۲۱۰ ہجری میں لکھا گیا، اور سنہ ۱۲۱۰ھ تک میر انشاء اللہ خاں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے، یا اسی سال نواب سعادت علی خاں کے ہاں رسائی ہوئی، کیوں کہ مرزا سلیمان شکوہ اسی سال (سنہ ۱۲۱۰ھ) لکھنؤ سے واپس دلی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی زبانی بیان کیا ہے، صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ "سعادت یار خاں رنگین کہا کرتے تھے"، مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے کہتے تھے، اور آزاد نے کس سے سُنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجالس رنگین کا حوالہ دیتے ہیں، مگر مجالس رنگین میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگین بھی سنہ ۱۲۱۰ھ میں لکھی گئی، میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے۔ اور چوں کہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اس لئے یہ بھی اس میں نہیں ہو سکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے ✦

مولف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے:—

"یہ کتاب ہم نے دو حصوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصہ ہے جس میں سلاطین نامدار، امرائے عالی مقدار اور شعرائے مشاہیر معتبر کے حالات لکھے گئے ہیں، اور دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہوگا✦"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں ✦

مولف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پیشتر سے کم کر دیا ہے، صرف اعلیٰ درجے کے اشعار رکھے ہیں، مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا ان کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے۔ خود مولف نے اپنے کلام سے صفحہ کے صفحے رنگ دیئے تھے، اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا ہے ✦

اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا، اور جو لوگ اردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے ✦

عبد الحق بی۔ اے (پرنسپل مدرسہ آصفیہ)
حیدرآباد دکن، اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رعنائی اور زیبائی، دلبرانِ سخن کو اُس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے، جس نے معشوقانِ زبانِ ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا۔ دلربائی اور رنگیں ادائی، نازفروشانِ ناطقہ کو اُس بے نیاز کی ثنا سے شامل ہے، جس نے محبوبانِ کلامِ اُردو کو زیورِ الفاظِ عربی اور فارسی کی آرایش کے ساتھ خرامِ ناز سکھایا +

ثنا اور حمد ہے اُس ذوالمنن کو — یہ بخشی جس نے رنگینی سخن کو
چمنلہ کے ہم نے معنی کی جو لی باس — تو ہر گل کی نئی بُو ہے نئی باس

سرسبزی اور شادابی، چمنِ بیان نے اُس بہارِ گلشنِ نبوت کی نعت سے پائی، جس کی آبیاریِ فیضِ عام کے باعث خارخارِ نظمِ دلخراش اُردو کا رشکِ رگِ گل ہے۔ تروتازگی اور سبزی گلبنِ معانی کو اُس رونقِ گلزارِ رسالت کی توصیف نے عطا فرمائی، جس کی نسیمِ نعت کی موج زنی سے ہر فقرۂ پریشان نظمِ ریختہ کا حسرتِ سنبل ہے۔ **قطعہ**

رحمۃ للعالمیں جب سے سنی ہے اُس کی ذات — گرمیِ خورشیدِ محشر سے نہیں کچھ بیم ہے
گو ہمارے جرم ہم کو آتشِ نمرود ہوں — وہ شفیع اپنا ہے، تو گلزارِ ابراہیم ہے

لہ اس مصرعہ میں تعقید ہے، اصل عبارت یوں ہے۔ معنی کے چمن کی جو ہم نے باس لی، باس لینا یعنی خوشبو سونگھنا +

آبداری تیغ زباں کو اُس جوہر شمشیر شجاعت کی منقبت نے بخشی ہے، جس کی سیفِ دشمن گداز کے مضمون نے دو مصرعۂ آبدار کو بخشا رتبہ ذوالفقار[1] کا۔ اور وسعت میدانِ سخن طرازی کو اُس شہسوارِ عرصۂ یکہ تازی کی تعریف نے عطا کی ہے، جس کی گشت گلگوں کی تحریر سے کمیتِ خامہ کرتا ہے صفحۂ کاغذ کو تختۂ گلزار کا

ہے گلستانِ ولایت کا وہ باب	تذکرے کا علمِ دیں کے انتخاب
لفظ و معنی مصرعِ آئیں کا ہے	مطلعِ دلکش بیاضِ دیں کا ہے
مدِ بسم اللہ سے لوحِ نجات	شاہ بیتِ کلیاتِ کائنات
اور فرزند اُس کے عالی دودماں	تا جنابِ حضرتِ صاحب زماں
آلِ پیغمبر اور اصحابِ کرام	ہو نزولِ رحمت اُن پر اور سلام

بعد حمد اور صلوٰۃ کے، رنگ دینے والوں کو چمن بیان کے معلوم ہووے، کہ شاہ گیتی افروز روشن ضمیر، شاہ عالم بادشاہ غازی کی بادشاہت میں، اور شمعِ شبستانِ دولت و اقبال وزیر اعظم ہندوستان نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ کی وزارت میں، اور رونق بزم انصاف و عدالت نواب عماد الدولہ امیر الممالک گورنر جنرل[2] وارن ہیسٹن جلادت جنگ بہادر کی ریاست اور امارت میں، علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے، اور نام اُس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سر حلقۂ بزم نکتہ دانی، رونق افزائے محفل معانی، سخن کی جان، اور سخن دانوں کی قدردان، صاحب والا مناقب، مسٹر گلکرسٹ[3] صاحب کی نظر مبارک سے گذرا

[1] یعنی ذوالفقار کا رتبہ بخشا ۱۲

[2] اس عہد ہندوستان کے گورنر جنرل دہلی کے دربار سے خطاب حاصل کرتے تھے، اور اُس کو فخریہ تحریر و تقریر میں استعمال کرتے تھے ۱۲

[3] یہ وہی گلکرسٹ صاحب ہیں جن کے ایما سے میر امن صاحب نے چار درویش لکھی۔ در حقیقت اردو زبان کا بڑا محسن یہی شخص ہے ۱۲

ازبس کہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبانِ ریختہ میں کیا جائے، تو خوب ہو، اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے، تو نہایت طبع کے مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزا پائیں گے، اور نومشق کیفیت بہت اٹھائینگے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خفی و جلی، **مرزا علی** کو کہ **لطف** تخلص کرتا ہے، نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ "تو اگر تن وہی اس مقدمہ میں کرے، تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں۔" اگرچہ یہ پابندِ الفت کا اس ایام میں ارادہ حیدر آباد کی سیر کا رکھتا تھا، لیکن اس خُلق مجسّم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا، کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا، کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، اور ایک سرِ مو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ خلق بھی سحرِ حلال ہے، جن لوگوں کا یہ آئین ہے اُن کا خوشا حال ہے۔ بغرض معا ئےدلی اُس صاحب عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا، کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں، ہم اُن کی تربیت کے لئے سامایہ خونِ جگر کھاتے ہیں، تاکہ اُن کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے، اور اُن کی طبیعت اُس سے بخوبی مزا اُٹھاوے۔[۱] تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے، تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں "سبحان اللہ" اور لفظ فارسی جگہ پاوے، تو ویسا جس کو نومشق پڑھ کر کہیں "واہ واہ" اُمید جناب اقدس الٰہی سے یہ ہے کہ اس طور پر سرانجام اور مقبولِ نگاہِ خاص و عام ہو۔

الحمدللہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی

---

[۱] اس فقرہ سے اندازہ کرو کہ اس وقت کے اہل قلم سادہ اُردو لکھنے کو کس قدر خلاف شان سمجھتے تھے مصنف صاحبان انگریز پر احسان رکھتا ہے کہ ان کی خاطر سے اس نے یہ ذلت گوارا کی ۱۲

کے ہیں، عہدِ سلطنت قایم ہے ایسے بادشاہ روشن دل خدا پرست سے، جس کی چشم حقیقت بیں کے سامنے دلقِ گدائی اور خلعتِ شاہی برابر ہے، اور نظر معرفت اثر کے روبرو مساوی کلاہِ فقیر اور تاج اسکندر ہے۔ تخت نشین بارگاہِ سرفرازی، **شاہ عالم بادشاہ غازی**، قایم رکھے اللہ تعالیٰ اس شاہِ بے آزار کو، اور زیادہ کرے اُس کی قدرت اور اقتدار کو۔ اور بالفعل مسند وزارت کو زیب اور زینت اُس رونق بخش بزم عیش و کامرانی سے ہے جس کی محفل عیش و نشاط کی غیرت سے تعجب نہیں ہے کہ زہرہ غرق عرقِ پشیمانی میں ہو، اور مشتری مانند آئینہ کے گرفتار بندِ حیرانی میں۔ ساغر نوش خمخانۂ دولت و اقبال، مخمور بادۂ جاہ و جلال، یمین الدولہ ناظم الملک **سعادت علی خاں** بہادر مبارز جنگ، ساقی روزگار جام اُمید کو اُس کے شرب مراد سے چھلکتا رکھے اور اس ایام فرخندہ فرجام میں محفل حکومت اور ایالت اُس امیر صاحبِ تدبیر سے رونق پذیر ہے، جس کی بہار گلشن عدالت میں تحقیقات سے چاکِ گریبان گل کی[لہ]، اور پرسش ہے نالہ مو لخراش بلبل کی، کہ گل کا گریبان کیوں چاک ہے؟ اور بلبل کی آواز کیوں دردناک ہے؟ سوسن کی زبان بندی سو سو بار ہوتی ہے، اور نرگس کے احوال کی تلاش ہے کہ راتوں کو کیوں نہیں سوتی ہے؟ اس زبان داری پر کیا باعث ہے سوسن کی بے زبانی کا؟ اس چشم خماری پر کیا موجب ہے، نرگس کی حیرانی کا؟ قمری کے طوقِ گردن کی جست و جو ہے، اور صدا اُس کی حق کو کو تک ہے، اُس میں گفتگو ہے، کہ کسی چیز کا اس کی گم ہونا ثابت ہوتا ہے لفظِ کو کو کی تکرار سے، گلا اس کا باندھا گیا کس تقصیر کے اقرار سے غنچہ کی گٹھری کو نسیم بے اجازت بہار کے کھولے، تو صاحب تقصیر ہے، اور زر نقد کو گل کے خزاں ہنسی سے بھی ٹٹولے، تو واجب التعذیر ہے۔

یہاں تک عمل اور انصاف ویسا کہ جس کا مشکل بیان ہے۔ عقل اور فراست ایسی کہ جس

لہ یعنی گریبان گل کی چاک کی تحقیقات سے ۔

میں قاصر زبان ہے ارسطو کو سامنے تقریر کے دعوی طفل دبستانی کا، اور افلاطون کو روبرو تحریر کے اظہار ہیچمدانی کا۔ یہاں تک تو اُس کی قدردانی سے اب علم کا رواج ہے، کہ مملکتِ جہل جاہلوں کے ہاتھوں سے ہوتی جاتی تاراج ہے۔ معمارِ حکم نے اُس کے وہ مدرسہ عالی شان بنا کیا ہے۔ جس کے بامِ عرش مقام کی پہلی سیڑھی اگر ساتویں آسمان کو کہئے تو بجا ہے۔ کرسی شاہ نشین کی گمنڈ عرش نشانی کا رکھتی ہے۔ نسبت اس کو بیت الشرفِ آفتاب سے کیونکر دی جا سکتی ہے۔ صفائی کو دیوار کی دیکھ کر فقط آئینہ ہی حیرت سے نہیں پشت بر دیوار ہے، بلکہ شرمندگی سے پانی پانی گوہر آبدار ہے۔ تعریف سے اُس امیر عالی منزلت کی عہدہ بر آ ہونا مجال نہیں ہے زبان کی، اور توصیف سے اُس والا مرتبت کی نکتہ سرا ہونا طاقت نہیں ہے بیان کی۔ شہسوارِ معرکۂ دشمن ستیزی، سر حلقۂ گروہ خرد پژوہ انگریزی، زبدۂ نوئیان عظیم الشان، مشیر خاصِ حضور فیض معمور بادشاہ کیوان بارگاہِ انگلستان، اشرف الاشراف مارکویس ولزلی، گورنر جنرل بہادر ناظمِ ممالک محروسۂ سرکار کمپنی انگریز بہادر، و میر اعظم عساکر بادشاہی و سرکار کمپنی متعلقۂ کشور ہند، فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی۔ عہد دولت میں اس عالی جناب کے ازبسکہ آرام اور چین ہر ایک شخص کے نصیب ہے، اور عز و وقار اہل علم کے قریب ہے، موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا، اور نام اس کا، بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے، **گلشن ہند** رکھا۔

اگرچہ احتیاج تاریخ کے نظم کرنے کی نہ تھی، کس واسطے کہ نثر میں سنہ ہجری اور عیسوی دونوں کی کیفیت لکھی ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاید یہی سمجھ کر گلزار ابراہیم میں تاریخ نظم سے چشم پوشی کی ہے، لیکن یہ نہ چاہئے، کیونکہ بہ نسبت نثر کے نظم پر ہر ایک شخص کان دھرتا ہے، اور حافظہ اس کو بہت جلد قبول کرتا ہے، تعجب کیا ہے کہ اس کا اشتہار ہو، اور اہل سخن کی زبان پر اس کی تکرار ہو، تو جس کو سنی سنائی بھی یہ تاریخ یاد ہوگی، اس کو بن دیکھے اس تذکرہ کے معلوم اس کی بنیاد ہوگی۔ بارہا صفات کے اشتہار سے ذات کو شہرت ہوئی ہے۔ اس فائدہ کے واسطے تاریخ

نظم اس کی اس طور پر لکھی گئی ہے۔ قطعہ

ہر ایک گل ہمیشہ بہار، اس حدیقہ کا	کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پلٹ سکے
حیراں پھریں ہیں بے سروپا ہمن اور دے	تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے

گلگشت کرنے والوں سے چمنستان نازک خیالی کے پوشیدہ نہ رہے، کہ اس نخلبند حدیقۂ بے استعدادی نے حسب الارشاد صاحب عالی شان مرقوم الصدر کے گلشن ہند کی دو جلدیں کی ہیں۔ جلد اوّل یہ جو تحریر کی جاتی ہے، اس میں عرش پروازیاں سلاطین نامدار کی، اور گوہر باریاں وزرائے والا تبار کی، اور خوش استعدادیاں امرائے عالی مقدار کی، اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی، جو کہ نام آور اور صاحب دیوان تھے، بیان کی گئی ہیں۔ اور جلد دوم میں مذکور کئے گئے ہیں شعرائے کم نام وغیرہ مشہور، یا وہ نومشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی۔ توفیق اس کتاب کی تمامی میں اُس مرجع کل سے چاہتا ہوں، کہ جس کی طرف رجوع ہے جزو کل کی۔ جل جلالہ و عم نوالہ۔

باب الف

۱۔ آفتاب

آفتاب تخلص، نور نیر جہانبانی، مہر سپہر صاحب قرانی شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی شاہزادگی میں گوہر صدف سلطنت کا نام عالی گوہر تھا۔ اُسی ایام میں عماد الملک کے خوف سے دلی سے نکلے، اور بعد بہت آوارگی کے نجیب خاں کے یہاں، کہ سردار قوم افغان کا تھا اور نجیب الدولہ خطاب رکھتا تھا، خلعت عنایت الٰہی کے ہو کر ٹھیرے۔ اس میں بعد ایک مدت کے محمد قلی خاں، بھتیجے نواب صفدر جنگ کو، کہ ناظم صوبۂ الہ آباد کا تھا، حوصلہ بنگالہ کی تسخیر کا دامن گیر ہوا، مشورے سے نواب شجاع الدولہ کے، کہ وہ باطن میں محمد قلی خاں کے برباد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، خان مذکور نے شاہزادے کو نجیب خاں کے ہاتھ سے بلوا کے، اور وسیلہ عزم کا ٹھیرا کے، آپ مع

فوج کے رکاب سعادت میں داخل ہوئے، اور الہ آباد سے کوچ کر کے قریب عظیم آباد کے آپہنچے
اب آگے رام نرائن، عظیم آباد کے نائب نظامت، کا بے حواس ہو کر محمد قلی خاں کی معرفت
حضور میں شاہزادے کے حاضر ہونا مشہور ہے، اور پھر بگڑ کے چند مدت قلعہ میں عظیم آباد کے بند ہو کر
لڑنا، یہ بھی تواریخ بینوں کی نگاہ سے نہیں مستور رہے۔

ابھی محمد قلی خاں قلعے کو لگے ہی ہوئے تھے، کہ اس میں بھاایک چند روز کے شہرہ جعفر علی خاں
اور میرن کی آمد آمد کا، واسطے رام نرائن کی کمک کے مع کرنیل کلف بہادر ثابت جنگ کے
مشرق کی طرف سے، ہوا۔ محمد قلی خاں نے اُن کی لڑائی سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت اپنے بیچ
میں نہ پاکے، پیش از اُن کے داخل ہونے کے، کوچ بنارس کی طرف کیا، اور شاہزادہ عالی تبار
عالی گوہر نے، کرم ناسی کی ندی[۵۷] سے، کہ صوبہ عظیم آباد کی سرحد میں ہے، عبور کر کے تھوڑی دور
گئے تھے، کہ باپ کے مارے جانے کا احوال اس طور سے سُنا، کہ مہدی قلی خاں کشمیری، علی قلی خاں
کے بھائی نے، کہ رفیق عماد الملک کا تھا، حسب الارشاد اپنے آقا کے حضور اعلیٰ میں عرض کی
کہ "ایک فقیر بہت بڑا صاحب کمال فیروز شاہ کے کوٹلہ میں آکے اُترا ہے، حضرت کو ملاقات
اس سے کرنی ضرور ہے" حضرت بیچارے اجل گرفتہ، حکم میں تو عماد الملک کے تھے ہی، اپنے
پاؤں سے آپ قبر میں تشریف لے لئے۔ وہاں فقیر کہاں تھا، کئی ایک خونخوار جفاکار، بے
شرم اور بے رحم اُس حجرے میں بٹھا رکھے تھے، جاتے ہی اس بے گناہ کو پیش قبضوں سے
مار کر لاش کو اوپر سے ریتی کی طرف کر دیا۔ شاہزادے نے سُنتے ہی اس خبر کے، گھٹولے میں
پہنچ کر، موافق ضابطۂ خاندان بابریہ کے ۱۱۷۳ء گیارہ سو تہتر ہجری میں القاب "شاہ عالم"
کے ساتھ تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔ اور قلمدان وزارت کا مع خلعت جلد نواب شجاع الدولہ
کے واسطے بھجوایا۔ ساتھ ہی اس کے خلعت امیر الامرائی کا، کہ عبارت میر بخشی گری سے ہے،

---

۵۷ یعنی اس ندی سے جس کا نام کرم تھا۔

نجیب الدولہ کے لئے روانہ ہوا۔ اور نواب منیر الدولہ نے اُسی وقت موافق ارشاد کے ایلچی گری کے طور پر ابدالی کی طرف کوچ کیا۔ اتنے میں کامگار خاں پانچ چھ ہزار سوار سے، اور دلیر خاں اصالت خاں اپنی تمام جمعیت سے حاضر ہو کر، اقرار جانفشانی کے ساتھ داخل دائرۂ دولت کے ہوئے۔ چنانچہ کامگار خاں نے اخراجات ضروری کا اپنا ذمہ کیا، اور زمینداروں سے اتنے ہی عرصے میں، جس جس ڈھب سے بنا، کچھ کچھ رُپیا بھی لیا۔ تجویز یہ ٹھہری کہ بیرن کے آنے سے آگے ہی رام نرائن سے لڑیئے، اور خدا فضل کرے، تو قلعے عظیم آباد کے عمل کیجئے۔ بادشاہ کو بھی یہ مشورہ پسند آیا، اور اسی وقت پیش خیمے کے کوچ کو حکم فرمایا۔ کامگار خاں اور دلیر خاں متصل رام نرائن کے لشکر کے، کہ دیو ہانڈی کے کنارے پر پڑا تھا، آپڑے۔ اور بعد کئی دن کے میدان جنگ آراستہ کر کے کمال جانفشانی اور سر فروشی کے ساتھ لڑے۔

سب سے پہلے دلیر خاں اور اصالت خاں نے گھوڑے چلائے، اور نہایت بہادری سے رام نرائن کی فوج میں در آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ غول ان کا نشانہ تھا چھروں کی مار کا، اور ہدف تھا بندوقوں کی باڑھ کا۔ بجلی کی طرح کڑک کر ہر ایک اژدہا توپ کا سا گرم آتش فشانی تھا، اور گولیوں کی بارش کے ساون بھادوں کا مینہ شہ مندگی سے پانی پانی تھا۔ اس میں بندوقوں کی مار سے نشان[۱] کے ہاتھی کا منہ پھر گیا۔ کسی نے دلیر خاں سے پکار کر کہا کہ "نشان کا ہاتھی پھر کھڑا ہوا"۔ فرمایا "کیا ہوا۔ ہاتھی پھرا، اور گو کہ آسمان بھی پھرے دلیر خاں تو نہیں پھرا"۔ یہ کہ کے دونوں بھائیوں نے کود کے گھوڑوں سے ایک تین سو جوانوں سے، کہ وہ رفیق ان کے تھے، ایسی ہی جانبازی کی کہ ساری زمین ان کی لاشوں سے بھر دی، اور تمام فوج رام نرائن کی تلے اوپر کر دی، خاطر خواہ دلاوری اور بہادری سے دل بھر کے، شجاعت اور تہور کا حق ادا کر کے، دونوں بھائیوں نے مع رفیقوں کے جان شیریں نثار کی، لیکن رام نرائن کی فوج میں بھی باقی نہ رہی جلادت گفتار کی۔

---

[۱] یعنی وہ ہاتھی جس پر نشان سلطنت تھا۔

اس میں توپ اور بندوق تو بند ہو ہی گئی تھی، کامگار خاں مع اپنی فوج کے جو ایک طرف سے بیٹھا، تو برابر رام نرائن کے جا نکلا۔ لوگ رام نرائن کے، ازبسکہ دلیر خاں کی لڑائی کھائے ہوئے تھے، دوبارہ کامگار خاں کے مقابلے کی طاقت نہ لا کے پسپا ہوئے۔

رام نرائن نے مقدمہ بے ڈول دیکھا، عین لڑائی میں کپتان کاکری صاحب سے کہلا بھیجا کہ آدھے لوگ اپنے میری کمک کو بھیجئے۔ کپتان مذکور نے موافق حکم نائب نظامت کے اپنی فوج کے دو حصے کئے، اور آدھے آدمی اِدھر بھیج دیئے۔ لیکن لوگ ان کے بھی تو لڑائی کی محنت اُٹھا چکے تھے، اور جس قدر چاہئے تھا جی لڑا چکے تھے، کچھ کام بن نہ آیا، اور کسی طرح سے بندوبست نے لڑائی کے انتظام نہ پایا۔ چنانچہ کامگار خاں نے گھوڑا رام نرائن کے ہاتھی سے ملا دیا، اور اتنے تیر اور نیزے مارے کہ اپنی دانست میں اُنہوں نے مار لیا، لیکن اس مدبّر نے زخمی ہو کر حوضے میں لپٹ جانے کو غنیمت جانا اور تختوں کی آڑ کو وسیلہ زندگانی کا گردانا۔ غرض لڑائی بگڑ گئی، بہت سے لوگ رام نرائن کے ساتھ کے مارے گئے، اور کچھ تھوڑے سے لوگ بھاگ بھی بچا نہ گئے۔ منّی دھر مع رحم خاں اور غلام شاہ کے، کہ ہراول فوج کے تھے، کامگار خاں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ احمد خاں قریشی اور مراد خاں، بیٹا بہرام خاں بلوچ کا، بھاگ کے رام نرائن کے شریک، عظیم آباد کی طرف قدم گزار ہوئے۔ شاہ عالم بادشاہ غازی نے فتح اور نصرت کے ساتھ کھیت پر ڈیرا کرنے کا حکم دیا، اور بھاگے ہوؤں کا پیچھا مطلق نہ کیا۔ اب آگے بیان ساتھ تفصیل کے موجب طول کلام کا ہے ✦

مختصر یہ کہ آج کے دن تک، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اور جلوس مبارک کو سنہ بیالیسواں ۴۲ ہے، وہ اورنگ نشین بارگاہِ جاہ و جلال تختِ سلطنت پر ساتھ عیش و نشاط کے حکمراں ہے ✦

سنہ تیسویں میں عہد سلطنت کے، مستطو علی خاں ناظر کی بے بصیرتی سے شیخ غلام قادر خاں

زبیلے نے جو کو نمکی کی ہے مفصل بیان اس کا غضب ہے، اور بہنایت ترک ادب ہے۔ لیکن حضرت نے خود اپنی زبان بلاغت بیان سے اس روداد کو اس تفصیل کے ساتھ نظم کیا ہے، کہ اور کسی بندۂ آستان دولت کی کیا مجال تھی کہ اس واردات کو اس بے ادبی سے زبان تک لاتا۔ ازبسکہ وہ غزل فارسی ہے، داخل کرنا اس کا بیچ کتاب کے خلاف آئین نثر ہندی کے معلوم ہوا، اس واسطے تیمناً و تبرکاً اس غزل کو حاشئے پر کتاب کے لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا لفظاً باللفظ کر کے اس طرح داخل کتاب کیا ہے نظم

حادثے کی اٹھی آندھی جو مری خواری کو ۔۔۔ دم میں برباد کیا میری جہانداری کو

مط صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما ۔۔۔ داد بر داد سر و برگ جہانداریِ ما

آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم ۔۔۔ بُود در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما

چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلکِ بہتر شد ۔۔۔ تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداریِ ما

داد افغان بچہ شوکتِ شاہی برباد ۔۔۔ کیست جز ذاتِ مبرّا کہ کند یاریِ ما

بود جانکاہ زر و مالِ جہاں ہچوں مرض ۔۔۔ دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما

کردہ بودیم گناہے کہ سزایش دیدیم ۔۔۔ ہست معروف کہ بخشند گنہگاریِ ما

کوہ سی سال نظارت کہ مرا داد بباد ۔۔۔ زود تر یافتہ پاداشِ ستمگاریِ ما

عہد و پیماں بمیاں داد و نمودند دغا ۔۔۔ مخلصاں خوب نمودند وفاداریِ ما

شیر را دم امعی بچہ را پروردم ۔۔۔ عاقبت گشت بمزد بہ گرفتاریِ ما

حق طفلاں کہ بہ سی سال فراہم کردیم ۔۔۔ کردہ تاراج و نمودند سبکباریِ ما

قومِ مغلیہ و افغاں ہمہ بازی دادند ۔۔۔ بسکہ گشتند مجتہد بہ گرفتاریِ ما

ایں گدا زادۂ ہمداں کہ بہ دوزخ برود ۔۔۔ بانیٔ جور و ستم شد بہ دل افگاریِ ما

گل محمد کہ نمرداں بہ شرارت کم نیست ۔۔۔ چہ قدر کرد وکالت پئے آزاریِ ما

نام ادو سلیمان و بدل بیگِ لعیں ۔۔۔ ہر سہ بستند کمر بہرِ گرفتاریِ ما

بس کہ خورشید کو لازم ہے طلوع اور غروب
شام یوں پھولی غرض میری سیہ کاری کو

آنکھیں نکلیں تو ہوا خوب کہ دیکھو نگا میں
غیر کے قبضے میں اورنگ جہانداری کو

مملکت کا بھی خیال ایک مرض تھا جانکاہ
گردشِ چرخ نے کھویا مری بیماری کو

کی اس افغاں بچے نے شوکتِ شاہی برباد
کون پہنچے گا خدا[1] چھوٹ مری اب یاری کو

جو کئے تھے گنہ اُن سب کی سزا کھینچی ہیں
شاید اب پوچھیں نہ وہاں میری گنہگاری کو

جو تھا تیس برس سے مرے گھر کا ناظر
پہلے حکم اُس نے دیا میری دل آزاری کو

بے گناہی نے مری اُس ستم ایجاد کے تئیں
جلد پہنچایا مکافات ستمگاری کو

حق طفلاں جو ہوا تیس برس میں نمک حرام
مار کر لے گئے یاں چھوڑ سبک بار[2] ی کو

قومِ افغان و مغل سب نے مجھے بازی دی
رکھا ہر اک نے روا میری گرفتاری کو

عہد و پیمان کئے اس میں، بھلا حقِ نمک
ان سے سیکھے کوئی آئینِ وفاداری کو

تھا جس افغاں بچے کو دودھ پلا کر پالا
بدلے اس حق کے وہ آیا میری خونخواری کو

نازنیں میری ہمدم جو تھیں یاں ایک نہیں
جز مبارک محل اس میری پرستاری کو

آصف الدولہ اور انگریز ہیں میرے دل سوز
کیا عجب آویں اگر میری مددگاری کو

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند کے تھے
ہوگی بے رونقی اس طرز جفاکاری کو

ترجمہ

شاہ تیمور کہ دارد سرِ نسبت با من
زود باشد کہ بیاید بہ مددگاریِ ما

مادھوجی سیندھیا فرزندِ جگر بندِ من ست
ہست مصروفِ تلافیِ ستمگاریِ ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دستورِ من اند
چہ عجب گر بنمایند مددگاریِ ما

راجہ و راو و زمیندار امیر و چہ فقیر
حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواریِ ما

نازنینانِ پری چہرہ کہ ہمدم بودند
نیست جز محل مبارک بہ پرستاریِ ما

گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدیم
باز فردا دہد ایزد سر سرداریِ ما

[1] یعنی سوائے خدا کے ۱۲ [2] یعنی یہاں صرف سبکساری اور تہیدستی چھوڑ گئے ۱۲

کوئی پہنچا دو خبر حال کی میرے، کہ نظام — شاید آ نکلے محبت سے خبرداری کو
شاہِ تیمور سے ہے اک سرِ نسبت مجھ کو — دور کیا ہے جو کرے دور دل آزاری کو
راجہ و راو زمیندار امیر او فقیر — چاہیئے مجھے سعادت میری غمخواری کو
آفتاب آج فلک نے کیا گر بے سر و پا — بخشے گا کل تجھے حق پھر تری سرداری کو

حضرت جہاں پناہ کے مزاج مبارک کو نہایت نظم کی طرف التفات ہے، اور بیشتر شغل اشعار میں کٹتی اوقات ہے۔ ان شعروں کو اُس جناب کی طرف منسوب کرتے ہیں +

کیجیے ہمدم بھلا کیوں کر نہ شکوہ یار کا ۔ — ہم تو بندے اُس کے ہوں، وہ یار ہوا غیار کا
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اُس نے آہ — ہو جیو یارب بھلا اس چشم آتشبار کا
صاف کل آنکھیں تری کہتی تھیں عاشق سے پکار — کر سکے عیسیٰ مداوا اپنے کب بیمار کا
خون ہووے گا گلوں کا دیکھنا ہرگز صبا — نام مت لینا چمن میں اُس بت خونخوار کا
زلف تیری دیکھ کے زاہد رگِ جاں سے بنا — جانتا ہیگا سعادت باندھنا زنّار کا ۔
کب ترے عشاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے — یاد آوے دل میں جب سایہ تری دیوار کا
دیکھ کر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب — کوئی بھی جانبر ہوا بیمار اس آزار کا
صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ — ڈھونڈھ جا کر ہر طرف نقشِ قدم دلدار کا

اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب
دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا ۔

صبح اُٹھ جام سے گذرتی ہے — شب دل آرام سے گذرتی ہے
وله
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گذرتی ہے

۲۔ آصف

آصف تخلص، نور کوکب ہمت اور شجاعت کا، خورشید آسمان مروت اور سخاوت

کا، نواب آصف الدولہ وزیر الممالک آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ، خلف نواب شجاع الدولہ مغفور کا ہے، اور پوتا نواب ابو منصور خاں صفدر جنگ کا۔ بعد وفات شجاع الدولہ کے کہ گیارہ سو ستاسی ۱۱۸۷ہجری تھے، اور شاہ جہاں پناہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت کو پندرھواں سنہ تھا، بلدۂ فیض آباد میں، کہ قدیم نام اس کا بنگلا ہے، مسند وزارت کو زینت اس عالی تبار نے بخشی ہے۔ ازبسکہ رسم کہن ہے کہ بادشاہ اور وزیر واسطے نام کے، عہد حکومت اپنے میں، نئے شہر کے آباد کرنے کی تلاش کرتے ہیں، اور وہاں مقر بود و باش کرتے ہیں۔ بعد چندے ہی اس آب ورنگ گلشن وزارت نے بنگلے سے کوچ کرکے خارستان لکھنؤ کو بہار قدوم سے اپنے رشک شگوفہ زار کشمیر کا کیا۔ لکھنؤ کے تن بے جان میں گویا جان آئی، اور چشم بے نور نے بصارت پائی۔ پھر تو آبادی پر شہر کے عرصہ زمین کا تنگ تھا، اور معموری کو اس خراب آباد کی تشبیہ سے ہفت اقلیم کی ننگ تھا۔ بسکہ اس بلند نظر کا اہل کمال کی طرف میلانِ خاطر تھا، ایک ایک کمال کا ہزارہا آدمی وہاں حاضر تھا۔ عمارت کی تعمیر پر طبیعت نہایت مصروف تھی، اور خواہش شکار کی مزاج سے بشدت مالوف تھی۔ ہر روز لازم تھا ایک عمارت تازہ کی بنا کا دھرنا، اور ہر سال عین واجب تھا واسطے شکار کے دو مرتبے سفر کرنا۔ بے مبالغہ ہے کہ ہزاروں شیر مانند بکریوں کے مارنے میں آئے، یہاں تک کہ اُن کی کھالوں کے متعدد خیمے عالی شان بنوائے۔ پہلی ہی گولی اس کے ہاتھ کی گینڈے اور ارنے کو تھا پیغام اجل کا، اور بڑے دانت ہوئے ہاتھی کے بس یہی اُس کے واسطے تھا دام اجل کا۔ مستک پر فیل مست کی جب اس کا تیر بیٹھا، سوفار کا باہر نام نہ تھا۔ پہاڑ کو تنکے سے ٹالنا اس کے آگے کچھ کام نہ تھا۔ جنگلی ہاتھی وتیلے اتنے مارے کہ آج دولت خانہ میں ایک عمارت عالی شان ہاتھی دانت کی موجود ہے جس کے ستون اور کڑیوں میں نام کو کہیں لکڑی کا نہیں وجود ہے۔ شجاعت کے سوائے سخاوت پر جب طبیعت آئی تو ہمت حاتم کی دل سے خلائق کے بھلائی۔ ایک دن میں

لاکھ روپیہ سے شریف مکہ کی خدمتگذاری کی، اور پانچ لاکھ روپے خرچ کرکے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کی۔ فیاض ایسا کہ جو کوئی سامنے کچھ لے گیا خالی نہیں پھرا ہے۔ بے مبالغہ ہے کہ خاک کی مٹھی کو اکثر اکسیر کی قیمت میں لیا ہے۔ اس میں کوئی گستاخ اگر اس کی قباحت زبان پر لایا، تو وہیں بے مزہ ہوکر اس سے فرمایا کہ "اتنی مروت کرنی اس شخص سے ہم نے مدت سے اپنے دل میں تھی ٹھیرائی، یہ چٹکی خاک کی جو اس سے لی یہ مفت میں پائی" غرض جو کچھ چاہیئے سب کمالوں کی جامعیت تھی۔ افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی۔ نائبوں کے ہاتھ میں اصالتًا ملک کا سرانجام رکھا، آپ فقط سیر اور شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لایق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا چھبیس[۲۶] برس کُل اس مربع نشین مسندِ وزارت نے حکمرانی کی، اور چمن گیتی میں مانندِ گلِ خورشید کے محتاجوں پر زر فشانی کی۔ آخر الامر ازبسکہ بیچ گلشن دنیا کے بہار اور خزاں آپس میں دست و گریباں ہیں، بیماری سے استسقی کی ۱۲۱۲ھ بارہ سو بارہ ہجری میں، کہ سلطنت کو شاہ عالم بادشاہ غازی کے چالیسواں سنہ تھا، اٹھائیسویں تاریخ ربیع الاول کی، پہر ڈیڑھ ایک دن رہے، حکومت عارضی کو ملک فنا کی چھوڑکر کارفرمائی اقلیم بقا کی اختیار کی۔ راقم آثم صغر سن سے ملازموں میں اس آستانۂ دولت کے مع رسالہ سرفراز تھا، اور افراطِ عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں اپنے مہر دا امتیاز تھا۔ اس شمع شبستان وزارت کی تاریخ وفات کا شعلہ اس جگر کباب کے گلخنِ طبع سے یوں آتش فشاں ہوا ہے

قطعہ

آصف الدولہ جب جہاں سے گیا — اک جہاں بے دل و دماغ ہوا
جام عمر اس کا بھرتے ہی لبریز — خلق کا[۱] عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتشِ غم سے — دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سالِ تاریخ کا خیال کیسے — خشک شعر و سخن کا باغ ہوا

[۱] یعنی خلق کے عیش کا ایاغ لبریز ہوا ++

بولے یوں دور کر کے پائے عتاد
آج گل ہند کا چراغ ہوا
۱۲ ۱۲

یہ اشعار اُس عالی جناب کے مشہور ہیں +

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دوجہاں سے گئے

تیرے کوچہ میں نقش پا کی طرح
ایسے بیٹھے کہ پھر نہ وہاں سے گئے

شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم
سنیو اک دن کہ جسم و جاں سے گئے

عشق! ہاتوں سے تیرے کیا کہئے
نام سے گذرے اور نشاں سے گئے

ایک دن ہم نے یار سے جو کہا
اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ سنتا ہے آصف
"یوں ہی کہہ کہہ کے لاکھوں یاں سے گئے"

دل ہمارا خانۂ اللہ کر مشہور تھا
ولہ سو بتوں کے عشق میں اب وہ بھی بتخانہ ہوا

آباد ملک دل وہ یارو کہاں رہے گا
ولہ جس جا یہ درد و غم کا نت کارواں رہے گا

آصف نہ چھٹے عشق بتاں دل ہمارے سے
ولہ سو بار اگر پھر بھی بناویں اسے گھڑ کر

شوخیٔ چشم کی شہرت کو تری سن سن کر
ولہ شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں

مرے دل کو زلفوں میں زنجیر کیجو
ولہ یہ دیوانہ اپنا ہے تدبیر کیجو

مرے دل نے زلفوں میں مسکن کیا ہے
یہ مہماں ہے اے شانہ، توقیر کیجو

جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے
ولہ آب سے آتش ہوئی کیوں کر ہم کیا جانتے ہے

پوچھتے کیا ہو شب ہجر کی حالت یارو
ولہ میں ہوں، اور رات ہے، اور بستر تنہائی ہے

آصف نہ چھوڑ دست سخاوت کو زینہار
ولہ لایا ہے کچھ نہ ساتھ نہ جائے گا تو لئے

یاں تلک داغ محبت دل نے کھائے ہیں کہ بس
ولہ سر سے پا تک ایک گویا صورت طاؤس ہے

ہزاروں مر گئے جیتے دیکھے تیر بات کرنے سے
ولہ لب معجزنیاں میں تیر شاید آب حیواں ہے

۳-انجام

انجام تخلص، عمدۃ الملک خطاب، نواب امیر خاں نام، والد ماجد ان کے عمدۃ الملک نواب امیر خاں ہیں، کہ جو عالمگیر خلد مکان کے عہد سلطنت میں زینت بخش مسند امارت کے تھے۔ سلسلہ نسب شریف کا اس عالی خاندان کے میر میراں نعمت اللہی کو، کہ سلاطین صفویہ کے ساتھ نسبت اور ناتا رکھتے تھے، پہنچتا ہے۔ بزرگ ان کے ہمیشہ ایران میں صدر نشین تھے محفل عز و وقار کے، اور ہندوستان میں بھی ہمیشہ انیس و جلیس رہے ہیں سلاطین نامدار کے۔ اس عالی دودمان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت برآر ہوئی تھی، کہ رشک تھا ان کی سب ارکان دولت کو، اور اعیان مملکت کو، حسد تھا۔ لطیفہ گوئی کی طرف طبیعت ان کی نہایت مصروف تھی، اور خوش طبعی سے مزاج بہ شدت مالوف۔ گردش چشم کے مجمع میں زمانے کے اُستاد تھے، اور شیریں کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد۔ موجد تازہ اندازی کی تہ داریوں کے اور اختراع کرنے والے چتون کی جادو کاریوں کے۔ گانے میں دخل ایسا تھا، کہ اُستاد اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے، اور نادیدہ کی باتوں میں بڑے بڑے گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے۔ بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا، کہ ایک دم کی جدائی اُن کی جہاں پناہ کو شاق تھی، اور آٹھ پہر طبیعت ان کی طرف مشتاق تھی لیکن موافقت و راندازی سے بدگویوں کی آخر آخر مبدل بہ غبار خاطر ہوئی، اور خواہان جان نہ بباطن بلکہ بظاہر ہوئی چنانچہ سنہ ۱۱۶۹ گیارہ سو اُنہتر ہجری میں ایک نمک حرام نے اُن ہی نوکروں میں سے انہیں کے مین صحن دولت خانہ میں بادشاہ کے قہر کیا، کہ اس روشن زبان کی زندگی کے چراغ کو ایک ہی جھوکے میں کٹاری کے بجھا دیا، اگرچہ اس نااہل کا بھی اُسی جگہ لگ گیا ٹھکانا لیکن افسوس ہے نواب امیر خاں کا مارے جانا۔ اکثر ارباب فہم کو گمان تھا کہ یہ اشارہ بادشاہ کا تھا اور رام جہاں پناہ کا ہے۔ جب اس نمک حرام کی لاش کو اُٹھوانے میں بادشاہ نے نہایت کرم

فرمایا، پھر تو عوام کو بھی اس گمان کا بے تامل یقین آیا۔

اس عالی طبیعت کو پہیلی اور مکرنی کے کہنے میں مشق حد سے زیادہ تھی، اور اشعار فارسی اور ہندی میں بھی چنگی استعداد تھی۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے آویزہ گوش صغار و کبار ہیں۔

کیوں بلایا بھی میں کیا مجھ سے نادانی ہوئی	دختر رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی
کل محیط عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات	کشتی دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی
ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز	ٹوٹتے ہی دل کے مجھ کو سخت حیرانی ہوئی
کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو	دوستداروں کی محبت دشمن جانی ہوئی

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم	ولہ	مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم
منہ ترا تکتے ہیں سب تسلیم حسن و عشق کے		تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
دل تو ہے داغ غلامی سے تری طاؤس وار		سامنے قمری کے گو ہیں سرو ساں آزاد ہم
اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا		عمر مانند شرر جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاس مکنت
شکر ہے، تڑپے نہ زیر خنجر جلاد ہم

۴۔ اُمید

اُمید تخلص، نام اصلی اس معدن کمالات کا مرزا محمد رضا ہے، رہنے والا ہمدان کا، ایام شباب میں وطن سے غربت اختیار کر کے وارد اصفہان کا ہوا ہے، اور میرزا طاہر سے کہ وحید جن کا تخلص تھا نسبت شاگردی کی درست کر کے کسب کمالوں کا کیا ہے۔ آخر سلطنت میں خلد مکان کے ہندوستان میں آیا، اور اول بادشاہت میں بہادر شاہ

کے خطاب قزلباش خاں کے ساتھ رتبۂ منصب ہزاری کا پایا، لیکن اس پائے سے ہمیشہ اس ایام میں شکوہ مند رہا ہے، اور منصب ہزاری کے مضمون کو ایک بیت میں اس طرح سے موزون بھی کیا ہے[۵۱]+

مثل بلبل کے ہوں سدا نالاں   یہ مرا منصب ہزاری ہے

محمد معز الدین کے وقت میں کسی خدمت کی تقریب سے برہان پور کو گیا، اور صوبہ داری میں امیر الامرا سید حسین علی خاں کی اس خدمت سے تغیر ہو کر خجستہ بنیاد میں حاضر ہوا +

اس جگہ تھوڑا سا احوال مجمل سید حسین علی خاں کی امیر الامرائی کا، اور صوبہ داری دکن کی جلوہ فرمائی کا، بیان کرنا ضرور ہے، کس واسطے کہ تغیر ہونا قزلباش خاں کا بخوبی معلوم ہوگا۔ جب کہ سنہ ۱۱۲۳ گیارہ سو تیئیس ہجری میں محمد فرخ سیر اور محمد معز الدین سے لڑائی ہوئی، تو سادات بارہ نے کمال جانفشانی کی، چنانچہ سید عبد اللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے، مع اپنے بھانجے بھتیجوں اور رفیقوں کے، حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بہادر خاں کے بیٹے کو، مع اُن کے رفیقوں کے، شریک کر کے بلا جو کیا، تو زنجیر سے توپخانے کے گھوڑوں کو کدا کدا کے مقابل ذوالفقار خاں کے، کہ بیٹا اسد خاں وزیر کا تھا، جا پہنچے، اور کود کود کے گھوڑوں پر سے جیسی چاہیے تھی جاں نثاری کی، اور داد مردانگی اور شجاعت کی دی۔ اس میں توپیں بند ہو گئیں تھیں، باقی فوج سے بھی تن دہی ہوئی۔ حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بیٹا بہادر خاں کا، یہ دونوں سردار مع اپنے رفیقوں کے بہادری کا حق ادا کر کے، کام آئے، اور سید حسین علی خاں چور ہو کر کھیت میں بیٹھ گئے۔ اتنے زخم اٹھائے، بارے سادات کے سر لڑانے سے پانوں طرف ثانی کے اُٹھ گئے۔ جو مرے سو مرے، اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ محمد معز الدین نے اپنی صورت بدل کر راہ دلی کی لی، اور محمد فرخ سیر کو اللہ تعالیٰ نے سادات کی نمک حلالی سے سلطنت عطا کی۔

---

۵۱ مثل بلبل ہمیشہ نالانم + ایں بود منصب ہزاری ما +

سید عبداللہ خاں، بھائی کو زخمی کھیت میں چھوڑ کر، فوج کا تعاقب کیئے چلے گئے ہیں، اور بادشاہ بعد ایک ہفتہ کے داخل دلی میں ہوئے ہیں۔ اس جانبازی کے عوض میں بادشاہ نے سید عبداللہ خاں کو وزیر اعظم کیا، اور قطب الملک یار وفادار سید عبداللہ خاں بہادر ظفر جنگ خطاب دیا۔ اور سید حسین علی خاں کو میر بخشی ہونے کے سوا منصب ہفت ہزاری عنایت ہوا، اور امیر الامرا سید حسین علی خاں بہادر فیروز جنگ خطاب ملا۔ بعد اس فتح کے جو خدمتیں کہ ان سے ہوئی ہیں، اور جو نمک حلالیاں کہ اُنہوں نے کیں ہیں مفصل بیان اس کا موجب طول کلام کا ہے، اور کچھ متعلق بھی نہیں اس مقام کا ہے۔ غرض توجہ بادشاہ کی ازبسکہ ان پر حد سے زیادہ تھی، حاسدوں کو بس یہی عداوت کی بنیاد تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں بدگویوں نے ان کی طرف سے بادشاہ کے دل میں سیکڑوں شبہے ڈال دیئے، غضب تو یہ ہے کہ اس عقل مجسم نے حاسدوں کے کہنے سے بے تامل مان لئے پھر تو دشمنوں نے تدبیر ان کے توڑنے کی یہ ٹھہرائی، کہ پہلے لازم دونوں بھائیوں میں ڈالنی جدائی۔ اس تقریب سے امیر الامرا سید حسین علی خاں کے واسطے تجویز صوبہ داری دکھن کی ہوئی، اور رخصت حضور سے ۱۱۲۷ گیارہ سو ستائیس ہجری میں اس مروت کے معدن کی ہوئی۔ ابھی دس کوس بھی دکن کی سمت کو نہیں گئی سواری گئی، کہ ساری دلی پکارتی تھی کہ جنگ چھوٹا اور نرد ماری گئی۔ قصہ مختصر بعد کتنے دنوں کے، اور طے کرنے منزلوں کے، جب نربدا سے عبور ہوا تو ایک فوج عالی شان لے کر واسطے لڑائی کے سامنے داؤد خاں ناظم برہان پور ہوا، کیونکہ فرمان بادشاہی معرفت خان دوراں خاں کے اس کو آگے ہی پہنچ چکا ہے، کہ دفعیہ بس امیر الامرا سید حسین علی خاں کے اگر تجھ سے مقدور ہوگا، تو گنہگار حضور کا نہ ہوگا۔ سبحان اللہ! یہ داؤد خاں وہی ہے، کہ اوائل سلطنت میں محمد فرخ سیر کے امیر الامرا نے اس کی جان بخشی کروائی ہے، اور احمد آباد گجرات سے اس کو باہر بھجوا کے سند صوبہ داری برہان پور کی حضور سے اس کے نام بھجوائی ہے۔ وہ حق احسان فراموش کر کے جان بخشی کے عوض میں خواہان جان ہوا۔

چنانچہ ۱۱۲۷ھ گیارہ سو ستائیس ہجری میں، گیارھویں تاریخ رمضان کی، لڑائی کا آراستہ میدان ہوا۔ بعد بہت سی خونریزی اور کشاکشی کے داؤد خاں نے بندوق کی گولی کھائی، بساط ہستی کی گنوائی، اور امیر الامرا فیروز جنگ نے ساتھ فتح اور فیروزی کے اورنگ آباد میں داخل ہو کر مسند حکومت کی آرائش فرمائی۔ اس حرکت سے کہ برہان پور کے ناظم سے ہوئی تھی، آتے ہی اہل خدمت برہان پور کے سب تغیر کئے۔ اس تقریب سے قزلباش خاں بھی معزول ہو کر حضور میں حاضر ہوئے۔ ازبسکہ سلیقہ علم مجلس کا اس مجموعۂ کمالات کو بہت بڑا تھا، اور مزاج دانی میں امرا کے بہ شدت دخل رکھتا تھا، طرز خدمت اس کی امیر الامرا کو نہایت پسند آئی، اور داروغگی حکومت کرناٹک کی واسطے قزلباش خاں کے قرار پائی۔ اس تقریب سے ارکاٹ کو گیا، اور ایک مدت بھر وہیں رہا۔ بعد زوال دولت سادات کے، کہ وہ قصہ مشہور ہے، اور یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے، قزلباش خاں نے رفاقت مبارز خاں کی، کہ ناظم حیدر آباد کا تھا، اختیار کی۔

چنانچہ ۱۱۳۷ھ گیارہ سو سینتیس ہجری میں، جب نواب نظام الملک آصف جاہ سے اور مبارز خاں سے میدان میں شکر کھیڑی کے، کہ سات کوس اورنگ آباد سے ہے، لڑائی ہوئی، تو قزلباش خاں بھی ساتھ تھا۔ مبارز خاں تو صیاد اجل کا نخچیر ہوا، اور قزلباش خاں دام ہستی میں پھنس کر دستگیر ہوئے۔ بعد کئی دن کے ایک غزل نواب کی تعریف میں، اور اپنے عذر تقصیر میں لکھ کر بھجوائی۔ بندش اس غزل کی نواب آصف جاہ کو پسند آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی، اسی وقت بموجب حکم قید سے نجات ملی، اور جاگیر قدیم بدستور سابق بحال ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی کہ قلعہ داری منی مرگ کی نواب نے عنایت فرمائی۔ یہ قلعہ ہے علاقہ میں کرناٹک کے، وہاں ہیرے کی کھان تھی۔ چنانچہ کشنا ندی ہے، اس کے کنارے سے ہیرا نکال کے وہاں تراشتے ہیں۔ چند مدت اس معدنِ معانی نے ہیرے کی کھان کی داروغگی میں اوقات نہایت

آب و تاب سے بسر کی، اور اسی عرصہ میں رخصت حج اور زیارت کی لی۔ بعد حاصل کرنے سعادت زیارت کے جو آیا، تو نواب آصف جاہ کو ویسا ہی توجہ اور عنایت کے ساتھ پایا۔ جب کہ سنہ ۱۱۵۰ گیارہ سو پچاس ہجری میں نواب آصف جاہ حضور طلب ہوئے، اور شاہ جہان آباد آئے، تو قزلباش خاں بھی ہمراہ رکاب تھے۔ اس میں کچھ شورش مرہٹوں کی تنبیہ کے لئے مامور ہوئے، اور قزلباش خاں اس سفر میں فقط پاس رفاقت کرکے جدا دلی سے مجبور ہوگئے۔

میر غلام علی آزاد تخلص، سروِ آزاد جو اُن کا تذکرہ ہے، اُس میں لکھتے ہیں، کہ جس ایام میں نواب آصف جاہ کو بھوپال کے سفر کا اتفاق ہوا، تو فقیر بھی عازم حج کا تھا۔ اس قافلے کے پہنچنے کو عنایاتِ الٰہی سے سمجھ کر چلنا راہ کا اور اُترنا منزلوں کا باہم اختیار کیا۔ چنانچہ قزلباش خاں سے مکرر اور متواتر ملاقاتیں اس سفر میں ہوئیں۔ عجیب مجمع کمالات نظر آیا۔ باوصف ولایت زائی کے ہندی راگوں کے گانے اور سمجھنے میں نہایت طبع چست اور فہم درست رکھتا تھا، اور خوش اختلاطی اور رنگین مزاجی میں بھی کوئی مقام اس سے نہیں چھوٹتا تھا۔ یہ لطیفہ اس کی زبانی ہے کہ "ایک دن میں نے کچھ شکایت زمانے کی نواب ذوالفقار خاں بیٹے نواب اسد خاں، وزیر جو تھے، اُن کے سامنے کی، سُن کر فرمانے لگے کہ "سچ ہے دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں"۔ میں نے عرض کی کہ "اگر دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں تو افسوس ہے آپ مجھ بغیر دنیا کو بسر کرتے ہیں، کہ میرا تخلص "اُمید" ہے"۔ غرض جب نواب آصف جاہ بھوپال میں پہنچے، تو فوج نے مرہٹے کی شدتیں کیں، اور لڑائیاں مکرر ہوئیں۔ اس میں نادر شاہ کے آنے کا غلغلہ ہندوستان کی طرف ہوا۔ نواب آصف جاہ نے اس ایام میں لڑائی کا طول دینا مناسب نہ سمجھ کے، ساتھ دارو مدار کے مصلحتاً صلح کی، اور مع قزلباش خاں کے داخل شاہ جہان آباد میں ہوئے۔ آگے نادر شاہ کا آنا، اور دلی کا لوٹے جانا، مشہور ہے، یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے۔ غرض جب والی ایران کا ایران کو گیا، اور شہر میں امن و امان ہوا، تو آصف جاہ حضور سے رخصت ہو کر پھر دکن کو سدھارے، اور قزلباش خاں نوکری

چھوڑ کر کمر کھول کر بیٹھ رہے، دلّی کی محبت کے مارے چندروز اور بھی ساتھ عیش و نشاط کے دیکھا جلوہ دم اور قدم کا، آخر ۱۱۹۵ء گیارہ سو پچانوے ہجری میں سکتے کی بیماری سے لاچار کیا سفر ملک عدم کا تقریب آٹھ ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس بلند طبع نے فکر کی ہے، اور ہندی میں گاہ گاہ بطور اختلاط کے کبھی کوئی غزل کہی ہے - یہ اشعار اُس ستودہ اطوار کے ہیں +

بانازِ حور و حُسنِ ملک، جلوۂ پری -
رفتم بہوش و گفتم "جانم فدائے تست"
ایسی نہ سیتا، اور نہ بھوانی نہ رادھکا
گفتم کہ "تیرے پانوں پڑم اُو بلائیم"

بامن کی بیٹی ایک مری آنکھ میں کھڑی[1]
غصہ کیا ہو گالی دیا، اور دگر لڑی
کرتا[2] نے نہ ایسی کوئی دوسری گھڑی
گفتا کہ "ڈاڑھی جار[3] مغل تجھ کو کیا پڑی"

گفتم اُمید وصل پہ ہم تیرے جیتا ہوں"
گفتا کہ "چل پرے دئی مارے تجھے مری"

ولہ

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
دل ہمارا سے کرتا ہے رات
درد دل اس سے جو ہم نے نہ کہا
دہر میں پاس نفس لازم ہے

در و دیوار سے اب صحبت ہے
غیر سے جو سرِ شب صحبت ہے
ایسی حاصل ہوئی کب صحبت ہے
شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار ہے زیر سر یار
آج اُمید کو دھت[4] صحبت ہے

---

[1] اور تذکروں میں کھڑی کی بجائے "پڑی" ہے جو "در نظرم افتاد" کا ترجمہ ہے ۱۲
[2] کرتا یعنی خدا ۱۲
[3] یعنی ریش سوختہ ۱۲
[4] یعنی لذہب ۱۲

۵- آرزو

آرزو تخلص ہے، سراج الدین علی خاں نام، متوطن اکبر آباد کے۔ باپ کی طرف سے سلسلہ اس بزرگوار کا شیخ کمال الدین، بھانجے سے شیخ نصیر الدین کے، کہ چراغ دہلوی جنکا لقب تھا، ملتا ہے، اور ماں کی طرف سے شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری کو پہنچتا ہے۔ چھوٹی عمر سے طبیعت اس بزرگ زادے کی پڑھنے لکھنے کی طرف مصروف تھی۔ چنانچہ چودھویں برس شعر کہنا شروع کیا، اور چوبیس برس کی عمر تک جتنی کتابیں درسی اور ضروری تھیں پڑھ چکا، فاضلوں سے عصر کے جس قدر کہ فائدہ چاہئے تھا اُٹھایا اور مرتبہ کو استعداد کے نہایت بلندی کو پہنچایا۔ بعد تحصیل علم کے بادشاہی منصب داروں میں داخل ہو کر وطن سے دور ہوا، یعنی اوائلِ سلطنت میں محمد فرخ سیر کی کوالیہ کی خدمتوں میں سے ایک خدمت کے ساتھ مامور ہوا۔ ۱۱۳۲ھ گیارہ سو بتیس ہجری تھی کہ دارالخلافہ ہندوستان میں آیا، اور زور شور شاعری کا زباں دانوں کو وہاں کے دکھایا۔ چنانچہ ۱۱۴۷ھ گیارہ سو سینتالیس ہجری میں، کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ ایران سے شاہجہان آباد میں تشریف لائے، تو اس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب اُن کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی، اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محجوب کی۔ آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھہرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کر کے ایک رسالہ لکھا ہے، اور نام اُس کا "تنبیہ الغافلین" رکھا ہے[1]۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں تو صاف نزاع معلوم

---

[1] مولوی امام بخش صہبائی نے ایک رسالہ قول فیصل نام لکھا ہے، جس میں خان آرزو کے اکثر اعتراضات کے جواب دئے ہیں ۱۲

ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے۔ غرض شاعر زبردست اور صاحب استعداد تھا، اکثر مضمون میں سے مضمون کو کرتا ایجاد تھا۔ لطیفہ گوئی اور ظرافت میں بہ شدت مشّاق، خوش طبعی اور رنگین مزاجی میں شہرۂ آفاق تھا۔ اگرچہ سر رشتہ ملاقات کا ان کو ایک جہان سے تھا، لیکن توسّل امورات دنیا میں نواب اسحٰق خاں سے تھا۔ بعد خرابی کے شاہجہان آباد کے نواب سالار جنگ کے ایما سے لکھنؤ میں آئے، لیکن فلک نیرنگ باز نے بیرنگی ہی کے رنگ دکھائے۔ چنانچہ لکھنؤ میں وصال ہوا ہے، اور لاش کو اُن کی، بموجب اُن کی وصیت کے، نواب سالار جنگ نے بعد سپردگی شاہجہان آباد کو بھجوا دیا ہے۔ بہت سی کتابیں اس ماہر فنون نے تالیف کی ہیں۔ اتنی تو نگاہ سے راقم عاصی کے بھی گزرے ہیں:۔ فن معانی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ نام اُس کا "موہبتِ عظمٰی"[1] ہے۔ اور فن بیان میں ایک رسالہ اس کی تصنیف سے مشہور "عطیۂ کبریٰ" ہے۔ اور ایک فرہنگ لکھی ہے، کہ نام اُس کا "سراج اللغت" ہے، بطور برہان قاطع کے۔ اور سوائے اس کے حال کی اصطلاحات میں ایک نسخہ تالیف کیا ہے، کہ مشہور ہے "چراغ ہدایت" کرکے۔ شرح اسکندرنامہ کی اور قصائد عرفی کی لکھی ہے۔ اور گلستاں کی شرح، کہ نام اُس کا "خیابان" ہے، تالیف کی ہے۔ ایک تذکرہ[2] فارسی گویوں کا نہایت لطیفوں کے ساتھ لکھا ہے۔ سوائے اس کے اور بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ ۱۱۶۹ھ گیارہ سو انہتر ہجری میں اس فراغ پڑھنے والے مدرسہ زندگی کے نے کتاب ہستی کو گردان کے اُستاد اجل سے درس فنا کا پڑھا۔ قریب تیس ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس کو کہنے کا اتفاق ہوا ہے، اور ریختہ کا قصد گاہ گاہ بطریق تفنن کے کیا ہے۔ یہ اشعار ہندی طبع زاد اُس کے مشہور ہیں:

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے جان کچھ تجھ پہ اعتماد نہیں	ملہ	زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے زندگانی کا کیا بھروسا ہے

[1] یہ رسالہ چھپ گیا ہے ۱۲ [2] اس تذکرے کا نام مجمع النفائس ہے ۱۲

آتا ہے صبح اُٹھ کے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

وله

دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک
کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو

اس تند خو صنم سے ملنے لگا ہے جب سے
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے
بادِ صبا یہ کہنا اس دل ربا پری کو

آب خواب میں ہم اُس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو"

فلک نے رنج تیرِ آہ سے میرے زبس کھینچا
لبوں تک دل سے شب نالہ کو میں نیم رس کھینچا

وله

مرے شوخِ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو
بہارِ حُسن کو دی آب اُس نے جب چرس کھینچا

رہا جوشِ بہار اس فصل گر یوں ہی تو بلبل نے
چمن میں دستِ گلچیں سے عجب رنج اس برس کھینچا

کہا یوں صاحبِ محمل نے سُن کر سوز مجنوں کا
تکلف کیا جو نالہ بے اثر مثلِ جرس کھینچا

نزاکت رشتۂ اُلفت کی دیکھو سانس دشمن کی
خبردار آرزو ٹک گرم گر تار نفس کھینچا

۶- آبرو

آبرو تخلص، شاہ نجم الدین نام، ساکن شاہ جہان آباد - اولاد میں شیخ محمد غوث گوالیری کے تھے - سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ داران قریب میں - اور صاحب دیوان تھے زبان ریختہ کے - ترکیب میں بیشتر اشعار اُنہوں نے ابہام کے کہے ہیں، یعنی اکثر وہ الفاظ شعر میں لائے ہیں، کہ جن لفظوں کے دو معنی ہیں، اگرچہ بامعنی یا لایعنی - محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے عہد سلطنت میں اُنہون نے جہان فانی سے رحلت کی ہے - ان شعروں نے آبرو ان کے دیوان کو دی ہے +

خوبرویوں کے ہواحق میں یہ تب کرنا دوا -
تیر کی بات رہی چپکے کی اور ابھی صفا

کیا سبب تیرے بدن کے گرم ہونے کا سجن		عاشقوں میں کون جلتا تھا گلے کس کے لگا
تو گلے کس کے لگی لیکن کسی بے رحم نے		گرم دیکھا ہوگا تجھ کو بیچ میں آنکھوں کے لا
آہ سرد اور چشم تر عاشق کی سے دسواس کر		بدبہت ہے مختلف جس وقت ہو آب و ہوا
دل مرا تعویذ کر تو لے کے اپنے پاس رکھ		تو طفیل حضرت عاشق تجھے ہووے شفا
ترش روئی چھوڑ دے اور تلخ گوئی ترک کر		اور کھانا جو کہ ہو خوش کا تری[۵۱] سو کر غذا

بو علی ہے نبض دانی میں بتاں کے آبرو
کیوں نہ ہووے عاشقی میں اس کا نسخہ کیمیا

بوسہ لبوں کا دینے کہا کہہ کے پھر گیا	ولہ	پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

قول آبرو کا تھا کہ "نہ جاؤں گا اس گلی"
ہو کر کے بے قرار دیکھو[۵۲] آج پھر گیا

وعدے تھے سب خلاف جو اس لب سے ہم تئیں	ولہ	کیا لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا
یہ سبزہ اور یہ آب رواں اور ابر یہ گھرا	ولہ	دوانا نہیں[۵۳] کہ میں گھر میں رہوں گا چھوڑ کر صحرا
چوپڑ[۵۴] کے کھیلنے کا سارا یہ ہے خلاصہ	ولہ	شاید کبھو وہ سر کا بیٹھے ہمارے پاس آ
تم اور گلرخوں سے اب آنکھ جو لگا سے		بادام کو پیارے پھولوں کے بیچ باسا
پی کر شراب جو تم ہم کو ڈراوتے ہو		کیا شوق کو ہمارے جانا ہے اور کا سا
جھپٹ آیا میں رقیبوں کو گویا مار دیا	ولہ	یار نے اپنے گلے کا مجھے جب ہار دیا
رستے کوئی[۵۵] اس طرح کے لالچی کو کب تلک بہلا	ولہ	چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا
میرے پیارے سے قاصد اپنے دل کی بات کہنا	ولہ	کہ جانے سے تمہارے جان کو مشکل ہے اب ہنسنا

۵۱ "خوش کا تری" یعنی "تیری مرضی کا" "خشکا" کا ایہام بھی مقصود ہے ۔ ۵۲ "دیکھو" کو "دکھو" پڑھنا چاہیے، ورنہ مصرع ناموزوں ہوگا ۔ ۵۳ "نہیں" "کونہ" کے لہجہ میں پڑھنا چاہیے ۔ ۵۴ یعنی چوپڑ کھیلنے سے سارا مقصد یہ ہے ۔ ۵۵ قدما "کوئی" "کوئی" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے ۔ یہاں بھی اسی طرح پڑھنا چاہیے ورنہ مصرعہ ناموزوں ہوگا ۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے	وله	کہ اس کو بد نما لگتا ہے جیسے چاند کو گہنا
سیج اوپر غیر کی رہتا ہے اب لوٹا ہوا	وله	زر کے لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا
جو لونڈا[۱] نام سن امرد پرستی کا چڑھے چو سنکے	وله	میں اس کو پیچ دے باتوں میں لگ جاتا ہوں چل قلما
عاشقوں میں جس کسی کا یار ہو راضی مرا	وله	وہ مرا دشمن ہے لیکن چاہتا ہے جی مرا
جس طرح سے اے نامہ بر آیا ہے چلا جا	وله	جا کر کے یہ کہہ کل نہیں آیا ہے تو آجا
فرہاد کا دل کوہ کنے کا بھرا پیالا ہوا	وله	مستی سے جس کی شوق کی بہہ نکلے متوالا ہوا
کچھ خبر ہی نہیں کہ کیا ہوگی	وله	اس دل بے قرار کی صورت
زندگی ہے حباب کی سی طرح	وله	باؤ بندی حباب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو		مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح
ابرو کے قتل کو حاضر ہوا کس کر کمر	وله	خون کرنے کو چلا عاشق پہ تہمت باندھ کر
جس وقت زخم تیر الگتا ہے غیر کے تئیں	وله	اُس وقت جان سیتی جاتے ہیں جان ہم
دھمکاتے ہیں ہم کو کمر باندھ کر	وله	کھولے ابھی تو جاوے میاں کا کل بھرم
کن نے آ باغ میں حیران کیا نرگس کو	وله	نہیں معلوم کہ یہ دیکھ رہی ہے کس کو
کہتا ہوں میں پکار، سنو کان دھر سجن	وله	جو اور سے ملوگے تو دیکھوگے ہم نہیں
ہرگز ترے لبوں کی سرخی کے تئیں نہ پہنچیں	وله	ہر چند سعی کر کر یاقوت و لعل مر جائیں
اک عمر سب سے چھپ کر رہی ہو ہم کو تم سے		راضی ہو گر کہو تو خلوت میں آکے کر جائیں
اتنا چلنا سجن کا بھولتا مجھ کو نہیں اک	وله	طرح وہ پانوں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے
زلف کے عقدے کھلے اب تو بھی مشکل ہوئی	وله	دل کے اوپر یہ نئے سر سے بلا نازل ہوئی
میاں[۲] کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے	وله	کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے
دل کب آوارگی کو بھولا ہے		خاک گر ہو گیا بگولا ہے

میر

[۱] اس شعر سے اُس زمانے کی اخلاقی حالت ظاہر ہوتی ہے ۔ [۲] یہی شعر بہادر(؟) تغیر جرأت کی طرف منسوب ہے ۔ ۲

پھرتے ہی پھرتے دشت دیوانے کدھر گئے	وله	وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے
مژگاں تو تیز تر ہے ولیکن جگر کہاں		ترکش تو ہیں بھرے پہ نشانے کدھر گئے
نازک تنی پہ اتنے مغرور ہو رہے ہو	وله	موسیٰ کمر نہیں تو فرعون کر رکھا ہے
آمد جیت کبھوں جنوں ستی خاطر نچنت کی	وله	اے کچھ بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی

٧- احسن

احسن تخلص، میرزا احسن نام، جوان نیک خصلت ہے۔ ابتدا میں میر رضا سے اتفاق اصلاح کا ان کو ہوا ہے۔ بعد اس کے میرزا محمد رفیع السوداسے مشورہ سخن کا کیا ہے ریختہ ان کا خالی کیفیت سے نہیں ہے، اور بندش شعر کی صاف اور شیریں ہے۔ فی الجملہ غربت بھی رکھتے ہیں، اور نستعلیق وغیرہ اکثر الخطوط بھلے چنگے لکھتے ہیں۔ ابتدا میں وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کی سرکار میں سررشتہ ملازمت کا رکھتے تھے، بالفعل کہ ١٢١٥ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک مدت سے نواب سرفراز الدولہ میرزا احسن رضا خاں بہادر کی رفاقت میں ایام زندگانی کے بسر کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں بود و باش ہے۔ اور یہ ان کا منتخب تلاش ہے +

ہجر میں کیوں کر نہ ہووے آہ و زاری بیشتر	ہے قرار اس دل میں کم و بیقراری بیشتر
کیوں نہ فکر دین و دنیا دل ہمارا بھول جائے	یاد رہتی ہے ہمیں پیارے تمہاری بیشتر
پیشتر تھی ہم کو اس سے دوستی اک طرح کی	اب تو بتلا دے ہے تلوار و کٹاری بیشتر
روز ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روتے ہیں ہم	وصل کی راتیں کٹیں یوں ہی ہماری بیشتر

بن کے خاک اب اس کے کوچے سے بھلا کیونکر اٹھو
ہے مزاج اپنے میں احسن خاکساری بیشتر

نہ نالہ ہے دل میں، نہ آہ حزیں ہے	کوئی دم ہے یاں، سو دم واپسیں ہے
گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا	ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے

گیا دل جو کوچہ میں چین جبیں کے — نہ پھر وہاں سے نکلا عجب سرزمیں ہے
قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر — کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے

نہ کھینچ آسماں پر سر اپنا تو احسن
سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

یارو وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا — ولہ — رام اُس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا

سر اپنے کو جیوں لے گئے ہم اُس کے قدم تک — ولہ — پہنچا دیا ٹھوکریں وہیں ملک عدم تک

سجدہ گہ ہے خاک احسن اب تو سارے خلق کی — ولہ — جان دی تھی اُس نے کس کی حسرت پابوس میں

دل ہو دیدار سے مایوس تو مسرور نہ ہو — ولہ — چشم میں روشنی طور سے بھی نور نہ ہو
بزم میں اُس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی — دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو

ہے مجھ میں رمق، دیدہ تجھے تا نگراں ہے — ولہ — جیوں شمع مرا تار نگہ رشتۂ جاں ہے

محروم ہم ہوں، محرم اسرار ہو کوئی — ولہ — خلوت میں ہو کوئی، پس دیوار ہو کوئی
راتوں کو اُس کے کوچہ میں جاتا تو ہوں ولے — دھڑکے ہے دل پڑا کہ نہ بیدار ہو کوئی

پہنچی جس وقت مجھے اس کی خبر آنے کی — ولہ — سدھ رہی مجھ کو نہ اپنے کی نہ بیگانے کی
تم تو دل مانگو ہو، یاں جان تلک حاضر ہے — بات یہ بھی ہے کوئی آپ کے فرمانے کی

۸- الہام

الہام تخلص، شیخ شرف الدین نام، لکھنؤ کے شیخ زادوں میں سے ہیں۔ صغر سن ہے دیکھتا ہوں ان کو، اسباب دنیا سے قانع بہ یک چادر ہیں، اور سر و پا برہنہ بیٹھے رہتے خاک پر ہیں۔ زود گوئی کی مشق اس مرد کو حد سے افزوں ہے، یہاں تلک کہ ایک مصرع نہیں لکھا جاچکتا کہ دوسرا موجود ہے۔ اسی طرح سو سو بیت تک ایک دریا جوش مارتا چلا جاتا ہے، لیکن اس زود گوئی کے باعث سے اکثر کلام ان کا گفتگو میں بھی آتا ہے۔ وہ دیوان فارسی زبان میں

رکھتے ہیں، اور ہندی میں بھی اکثر کچھ کچھ کہتے ہیں۔ آگے ملول تخلص کرتے تھے، اب تخلص الہام ہے۔ بیشتر اہل لکھنؤ کو، شاگردی کے سوائے، ان سے اعتقاد تمام ہے۔ یہ غزل ان کی جو لکھی جاتی ہے، البتہ ایک عالم کو اضطرارِ دل کا دکھاتی ہے ✦

دیکھا نہ ہو جس نے کبھو سیماب کا عالم	آ دیکھے وہ میرے دلِ بیتاب کا عالم
اے ابرِ مژہ ناصحوں کی ضد سے تو یکبار	سب ارض و سما آوے نظر آب کا عالم
یاقوت کی رنگت پہ کبھی آنکھ نہ جاوے	دکھلاؤں اگر چشم کے خوناب کا عالم
گل پرتوِ حسنِ رخِ دلدار کے آگے	پھیکا نظر آیا ہمیں مہتاب کا عالم

مانی تراو اللہ ۵ہو بندا
کھینچے تو اگر دل کے تب و تاب کا عالم

اری بیکسی تیرے قربان ہوں	ولہ	برے وقت میں ایک تو رہ گئی

۹۔ اثر

اثر تخلص، میر محمد نام، شاہجہان آبادی۔ چھوٹے بھائی تھے خواجہ میر درد مرحوم کے، واقف تھے فن تصوف سے، اور آگاہ تھے علمِ معرفت سے۔ بطور درویشان صاحب معنی کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی، اور درد و اثر کے ساتھ نہایت طبیعت ہموار کی تھی۔ بھائی سے اپنے اُنہوں نے کسب کمالوں کا کیا ہے، سچ تو یہ ہے کلام ان کا چاشنی سے درد و اثر کی آشنا ہے۔ ایک مثنوی بہت طولانی بیان عشق میں ان کی تصنیف سے ہے، اگرچہ انتخاب اس کا لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے ✦

آہ کے ساتھ جی نکل نہ گیا		آہ اے آہ یہ خلل نہ گیا
میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ	ولہ	پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا

۵ اصل نسخہ میں سادہ جگہ چھوڑ دی ہے غالباً "یہ الہام" کا لفظ تھا ۱۲

بس ہو یارب یہ امتحان کہیں	وله	یا نکل جائے اب یہ جان کہیں
وائے غفلت! کہ ایک ہی دم میں		میں کہیں، اور کاروان کہیں
بے وفا تجھ سے اب گلا ہی نہیں	وله	تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں
یا خدا پاس، یا بتاں کے پاس		دل کبھی اپنا یاں رہا ہی نہیں
دل سے جو چاہئے سو باندھئے بات		میں نے واللہ کچھ کہا ہی نہیں
تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں	وله	پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں
دردِ دل چھوڑ جائیے، سو کہاں؟		اپنے باہر تو یہاں گذر ہی نہیں
حال میرا نہ پوچھئے مجھ سے		بات میری تو معتبر ہی نہیں

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ میں	وله	ہیں سب وگرنہ یہ تری باتیں نگاہ میں
ہم ہیں بیدل، دل اپنے پاس نہیں	وله	آہ اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں
پوچھ مت حالِ دل مرا مجھ سے		مضطرب ہوں مجھے حواس نہیں
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر		مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی تو ہم کو آس نہیں

میں کہاں تو کہاں، یہ کہتے ہیں	وله	کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں
جو سزا دیجے، ہے بجا، مجھ کو	وله	تم سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو

وہی میں ہوں اثر وہی دل ہے
اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

ایک تنہا خاطرِ محزوں، جسے آزار سو	وله	ایک مجھ بیمار سے وابستہ ہیں آزار سو

کچھ ان روزوں دل اپنا سخت بے آرام رہتا ہے	ولہ	اسی حالت میں لیکر صبح سے تا شام رہتا ہے
بیاں میں کیا کروں اب اس سے آگے اپنی ناکامی		ترے یہ طور، اور مجھ کو تجھی سے کام رہتا ہے
اثر کیجے کیا، کدھر جائیے	ولہ	مگر آپ ہی سے گندھا جائیے
کبھو دوستی اور کبھو دشمنی		تری کون سی بات پر جائیے
صرفِ غم ہم نے زندگانی کی	ولہ	واہ کیا خوب زندگانی کی!
ناک تیری عجب سجیلی ہے	ولہ	پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے
ناک ہے، یا کہ ایک توتا ہے	ولہ	چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
تجھ ایسے ترے ہونٹ پھڑکتے ہیں		جانور وحشی جیوں پھڑکتے ہیں
ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں		شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں
دانت جب مجھکو یاد آتے ہیں		دل کلیجا سبھی چباتے ہیں
دیکھ کر آنکھیں آبدار کو یہاں		لوٹ جاتا ہے گوہرِ غلطاں
گر کبھو اس کے جی میں آوے ہے		مسی دو انگلیاں لگاوے ہے
دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے		رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے
جب خیال آبندھے ہے گردن کا		یہاں ڈھلک جائے ہے مرا منکا
گو کہ شفاف ہے تنِ مینا		یہاں تو جھکتی ہے گردنِ مینا
کیوں نہ کھینچے وہ سب سے آپ کو دور		جس میں ایسا بھرا ہوا ہو غرور
دھیان میں جب بازو آتے ہیں		ہاتھ پاؤں اپنے پھول جاتے ہیں

کیا خوش ترندیہ کلائی ہے
اس کو دل لینے کی کل آئی ہے

۵ے مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے ۱۲

۱۰- الم

الم تخلص، صاحب میر نام، شاہ جہان آبادی۔ خلف الصدق خواجہ میر درد مرحوم کے۔ درویش صاحب حقیقت اور پہچاننے والے رموز معرفت کے ہیں۔ سنہ ۱۱۹۴ گیارہ سو چورانوے ہجری میں رونق بخش بلدۂ مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور دوستی سے راجہ دولہ رام کی چند مدت اس شہر میں رہے تھے۔ بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ ہجری ہیں، شاہ جہان آباد میں توکل اور قناعت کے ساتھ اوقات شریف کو بسر کرتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں۔

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکھڑ کر	بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر
ہنگامِ فغاں تھا خس و پنبہ قفس و دام	تارِ رگِ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر
جب نام خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو	مرجائیں صفوں کی صفیں حیرت سے پچھڑ کر
مندیل کا تو پیچ اٹھا بیٹھے گا اے شیخ	چھٹ اس کے نہ کچھ پاویگا رندوں سے جھگڑ کر

آجاتا ہے ذکرِ درد بھلانے کو الم یہاں
کیا اس سے مزا تم ہو اٹھاتے بھلا لڑ کر

رباعی

نہ دل کو قرار بے قراری کے سبب
نہ چشم کو خواب اشک باری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو
جو کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

۱۱- اشتیاق

اشتیاق تخلص، شاہ ولی اللہ نام، متوطن سرہند کے۔ اس رونق بخشِ دینِ احمدی کا سلسلۂ ارادت شیخ احمد کو، کہ مجدد الف ثانی جن کا لقب تھا، پہنچتا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاہ محمد گل کو مرید ان کا لکھا ہے، لیکن راقم حقیر کے گوش زد یہ مضمون نہیں ہوا ہے۔ فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب کے نہایت بلند تھا خصوص علم حدیث اور تفسیر میں بہت

بڑی دستگاہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدۂ روزگار کا زبانِ خلائق پہ آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کرکے جاری ہے۔ اکثر کتابیں تصنیف اس بحرِ علم کی مشہور ہیں۔ چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسنین" ہے، اور دوسرے کا نام "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ"[1] کہتے ہیں تصنیفات سے اس محی الدین کی یادگار صفحۂ روزگار پر ہیں۔ والد ماجد ہیں یہ اُس رونق بخش کشورِ قناعت کے، کہ جس کا نام نامی مولوی عبدالعزیز ہے۔ آج کے دن تک قدمِ توکل گاڑے ہوئے شاہجہان آباد میں بیٹھے ہیں، باوجودیکہ تفضل حسین خاں مرحوم نے موجب ایما صاحبانِ عالی شان کے مدرسہ قدیم کی مدرسی کے واسطے تحریک اس مرکز دائرۂ قناعت کی چاہی، لیکن اس قطبِ آسمانِ ملت و دین نے مطلقاً حرکت جگہ سے نہ فرمائی۔ اس فاروق زماں کی بھی تالیف سے ایک کتاب ہے، کہ نام اس کا "تحفۂ اثنیٰ عشریہ" ہے، اور دوسرا نام "رد روافض" شاید کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے دیکھیے سے اس کتاب کے استعداد اس بزرگ زادے کی معلوم ہوتی ہے، کہ کیا دریا فصاحت کا بہایا ہے۔ کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے۔ فی الواقعہ کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں، اور نابکاروں کے نابکار، بقول ایک شاعر کے ✦

شیر کے بچے میں عرّش شیر سا فزود ہے	بھونک میں کتّے کی پلّی کی سگی موجود ہے

الغرض وہ جامع جمیع علوم یعنی شاہ ولی اللہ مرحوم حین حیات میں اپنی کوٹلہ میں فیروز شاہ کے تشریف رکھتے تھے۔ اوقات شریف کو بطور درویشانِ اہل معنی کے بسر کرتے تھے۔ اشعار فارسی کے فرمانے کا اتفاق کم ہوتا تھا، اور زبان ریختہ کا مشغلہ اکثر۔ یہ اشعار خلاصۂ افکار اُس حقیقت آگاہ کے ہیں ✦

[1] دونوں نام غلط ہیں۔ پہلی کتاب تفضیل شیخین میں ہے۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کی ابطال سے خدا نخواستہ اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے۔ معاویہ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں ۱۲

[2] شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب، دونوں کی مصنف نے ہجو ملیح کی ہے، اور اس شعر نے تو صاف پردہ اٹھا دیا ہے ۱۲

خیال دل کو ہے اس گل سے آشنائی کا	نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا
کہیں وہ کثرتِ عشاق سے گھمنڈ میں آ	ذروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا
مجھے تو دھوکے[ل] تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج	غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا
جہاں میں دل نہ لگانے کا لیوے پھر کوئی نام	بیان کروں میں اگر تیری بے وفائی کا
نہ چھوڑا مار بھی کھا کر گذر گلی کا تری	رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا
نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی	غرور ہے جنہیں در کی تری گدائی کا

جفائے یار سے مت اشتیاق پھیر کے مُنہ
خیال کیجو کہیں اور جبہہ سائی کا

لڑکوں کے پتھروں سے لگے کیونکہ اسکو چوٹ	ولہ	پر ایکسکر دیا ہے یہ مجنون کو ڈھول کوٹ
چھوڑ کر تجھ کو ہمیں غیر سے جو لاگ لگی	ولہ	نہیں مہندی یہ ترے تلوؤں سے ہے آگ لگی
دو بالا ہوکے مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ہے	ولہ	پیالہ اور بھی پی پی سجن یہ دور چلتا ہے

۱۲۔ انشا

انشا تخلص، میر انشاء اللہ خاں نام، بیٹے ہیں حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے، مصدر جن کا تخلص تھا۔ عجب شخص خوش اختلاط اور صاحب استعداد ہے۔ سوائے قصیدوں کے مثنویاں زبان عربی میں انہوں نے نظم کی ہیں، اور ترکی کی غزلیں بھی ان کی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ زبان فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ کشمیری اور مارواڑی کے سوا اور بھی بہت سی بولیوں کے زبان دان ہیں۔ سال گذشتہ انہوں نے ایک قصیدہ زبان ریختہ میں غیر منقوط، یعنی جن کے اشعار میں کوئی حرف صاحب نقطہ نہیں ہے، نواب عماد الملک کی مدح میں لکھ کر کابل بھجوایا۔ وہاں صلے میں اس کے انعام تحسین اور آفرین کا بہت

[ل] یعنی منہ دیتا تھا ۱۲

ساپایا - بالفعل کہ سنہ ۱۲۵۱ ہجری ہیں، مرشدزادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے سایہ عاطفت میں لکھنؤ کے اندر اوقات ساتھ قناعت اور شکستہ پائی کے بسر کرتے ہیں۔ دیوان انکا زبان ریختہ میں مشہور ہے، اور کلام ان کا ظرافت اور خوش اختلاطی سے معمور۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں +

تم جو کہتے ہو، "مجھے تو نے بہت رسوا کیا"
کیا گنہ، کیا جرم، کیا تقصیر میں نے کیا کیا

واسطہ، باعث، سبب، موجب، باعث، کچھ بات بھی؟
راز وہ کم بخت آیا تھا، میں نے جو افشا کیا

کیا کہا؟ کن نے کہا؟ کس سے کہا؟ کب؟ کس گھڑی؟
کس جگہ؟ کس وقت؟ کس دم؟ آپ کا چرچا کیا

کچھ پتا بھی؟ نام اس کا؟ شکل کیسی؟ وضع کیا؟
جس کسی نے آن کر مذکور اس ڈھب کا کیا

گبر ہے وہ؟ یا مسلمان؟ یا نصارا؟ یا جہود؟
اس طرح کا تذکرہ جس شخص نے میرا کیا

شیخ ہے وہ؟ یا مغل ہے؟ یا کہ سید؟ یا پٹھان؟
مونچھ داڑھی ہے؟ کہ مولا نے اسے تم سا کیا؟

ہے جواں سا؟ یا وہ امرد؟ یا کہ بوڑھا؟ یا ادھیڑ؟
مرد ہے؟ یا حق تعالیٰ نے اسے خنثا کیا؟

نوکری پیشوں میں ہے؟ یا اہل حرفہ وہ عزیز؟
کون ہے جس نے ابی با سے تمہیں بہکا دیا؟

کس محلہ میں رہے ہے؟ ہے کہاں کا وہ خبیث؟
کوئی شیطاں ہے کہ جس نے لہ ڈرا یا کیا

کذب، بہتاں، افترا، طوفاں، غلط، بالکل دروغ
میں تمہارا نام لے کب بھلا رو یا کیا

مرحبا، شاباش، اے رحمت خدا کی، آفریں
میرے حق میں تم نے یار اور کا کہنا کیا

چودھویں تاریخ اک ابرِ تنک سا تھا جو رات
صحنِ گلشن میں سحاب سیر میں دیکھا کیا

جھلملی سی چادرِ مہتاب، اوپر برق کا
وہ دوپٹا بادلے کا سا جو لہرایا کیا

یوں لگا معلوم ہونے، ہیں یہ دو پریاں بہم
ایک نے گویا کہ سایا دوسری پر آ کیا

ہوئے گل بولی کہ آج آپس میں بدلی اوڑھنی
چاندنی بائی نے بی خیلا سے بہنا پا کیا"

خوب دولت تو نہ آئے، اور انشا رات بھر
آپ بن رویا کیا، لوٹا کیا، تڑپا کیا

گالی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی — یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کے کہنے سے مانا ہو کچھ بُرا — میری طرف کو دیکھیے! میں نازنیں سہی
آگے بڑھے جو جاتے ہو کیوں کون ہے یہاں — جو بات تجھ کو کہنی ہے مجھ سے یہیں سہی

منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ انشاؔ سے کیں سہی

ولہ

بندہ اُسے جب نظر پڑا ہے — بولا ہے "چل اُٹھ یکھر پڑا ہے"

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اُس کے ہم انشاؔ
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

۱۳- امانیؔ

امانیؔ تخلص، میر امانی نام، خلف ہیں یہ خواجہ آشیؔ کے، جن کا مذکور اوپر ہوا ہے۔ ۱۱۸۱ھ گیارہ سو اکیاسی ہجری میں وارد مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور جناب سید الشہدا کی تعزیہ داری کا شغل ہمیشہ رکھتے تھے۔ مرثیۂ ہندی اپنے کہے ہوئے اکثر ممبر پر کھڑے ہو کر پڑھتے، اور مومنین کے تئیں سعادت گریہ کی دولت سے داخل ثواب کرتے۔ ایک شب جناب سید الشہدا علیہ السلام کی عین تعزیہ داری میں، کہ ۱۱۸۷ھ گیارہ سو ستاسی ہجری تھے، بیہوش ہو کر سیر کرنے والے روضۂ رضوان کے ہوئے۔ حق سبحانہ تعالیٰ مغفرت کرے عجب مرد خوش اعتقاد اور دیندار تھا۔ نشۂ محبت میں اہل بیت نبوی کے سرشار تھا۔ یہ اشعار یادگار اُس نکوکردار کے ہیں۔

اُس کے کوچہ ستی غبار اُٹھا — کون ساواں سے خاکسار اُٹھا
عندلیبو بساؤ اب صحرا — باغ سے موسمِ بہار اُٹھا
ہچکیاں لے گلابیاں روئیں — بزم سے جب وہ مے گسار اُٹھا

عزمِ رخصت ہوا جب ہی اُس کا ‏— میرے دل سے وہیں تو الہ اُٹھا
نہیں جو قدرِ اشک، عالم سے ‏— موتیوں کا مگر وقار اُٹھا
شمع سے سوز امانی پوچھا تیرا ‏— اک دھواں اسکے دل سے یار اُٹھا

وله
راہ تکتے تکتے آخر جیسے آیا تنگ دل ‏— آنکھیں تو پتھرا گئیں، پروہ نہ آیا سنگدل
ہو چکا ہے غم سے خوں، اب جلد بہہ جائے کہیں ‏— خوف ہے یارب! نہ بہہ لے اور بھی کچھ رنگ دل
قدر جان اس کی کہ اک عالم سے یہ بیگانہ ہو ‏— گر رہا ہے تیرے در پر کھو کے نام و ننگ دل
فندقِ پا کس کی دیکھی آہ! جسکے غم سے آج ‏— قطرۂ خوں ہو بنا رشکِ گلِ اہنگ دل
اپنی آنکھوں آگے کو اس کی گلی میں ہے پڑا ‏— پر امانی آپ سے ہے سیکڑوں فرسنگ دل

وله
گھیرا ہے مجھے غم نے عجب حال ہے جی کا ‏— اے نالۂ دل! وقت ہے فریاد رسی کا
سینہ میں جدھر رو ہو ترا پھونک دے اے آہ ‏— تک دل سے خبردار! کہ یہ گھر ہے کسی کا

اُس کے کوچہ سے صبا آج اس طرف آئی نہیں ‏— وله دیر ہوئی وہاں مقیموں کی خبر پائی نہیں
وائے اپنی اس بصارت پر، کہ ہر ذرہ میں آہ! ‏— جلوہ گر ہے آفتاب، اور تاب بینائی نہیں

وله
کونسا دن ہے کہ مجھ کو یاد تو آتا نہیں ‏— کونسا دم ہے، کہ آنکھوں بیچ پھر جاتا نہیں
عشق میں کس کے امانی مبتلا ہے، جس بغیر ‏— تجھ کو نظارہ گلوں کا ان دنوں بھاتا نہیں

وله
چمن سب لٹے ہیں پڑے، بادل برستے ہیں ‏— شتاب آ ساقیا! ہم بادہ نوشی کو ترستے ہیں
.. نہ جائے عبرت ہے، چمن کا حال چل دیکھو ‏— تجمل جن گلوں کا کل تھا سو وے آج جھڑتے ہیں
مساوی جانیو خوش طالعی و کم نصیبی کو ‏— امانی منعم و مفلوک سب کے دن گذرتے ہیں

امانی تو ہوا تیغ تغافل ہی ستی بسمل ‏— وله بھلا بتلائے کس پر کر اب آپ کستے ہیں

وله
ہم ترا نزع تلک جور سہے جاتے ہیں ‏— یاد آویں گے بہت اتنا کہے جاتے ہیں
لے گیا کون مری تاب و تواں کو یک لخت ‏— کہ سب ہی عضو میرے آج ڈھہے جاتے ہیں
وائے واماندگی اپنی کہ یہ آنکھوں آگے ‏— کارواں رو میں ہے، ہم پیچھے رہے جاتے ہیں

اثر ہو سنگ میں کیا، کیوں کلان کو رام کریں	ولہ	بتوں کے دل ہو، تو یارب یہ آہیں کام کریں
وہ ایک بار بھی تیری نظر پڑے زاہد		صلاح و زہد رہے یہ، تو ہم سلام کریں
کس کے یہ خارِ مژگاں دل میں کھٹک رہے ہیں	ولہ	جو چشم سے لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں
دیکھو تو کیا ہی وہ بت سنگ دلی پہ نازاں	ولہ	تجھ میں اے نالۂ جانکاہ! اثر ہے کہ نہیں
یارو گر دار پہ منصور نہیں دیکھا ہے -	ولہ	نوکِ مژگاں پہ مرے لختِ جگر کو دیکھو
صفِ مژگانِ آہو چشم کا ہوں کشتہ، اے یاراں	ولہ	سرِ تربت پہ چن دیجو مرے خارِ بیاباں کو
زباں پر رازِ عاشق کا نہ لانا سر کٹا دینا		سرِ رشتہ کس سے ہاتھ آیا ہے یہ شمعِ شبستاں کو
میں نے پہلو سے گم کیا تجھ کو	ولہ	آہ دل! اُن نے لے لیا تجھ کو
اشک، آوارگی سے تو نہ تھا		میں نے آنکھوں میں گھر دیا تجھ کو
نالوں سے دل پھپھولو کیا سوخت کر رہے ہو	ولہ	پھوٹو کہیں، کہاں کی آتش میں بھر رہے ہو
اور میانِ خالِ شکر لب پہ تمہارے	ولہ	بوسہ میں بھی شاید مزۂ تل شکری ہو
اللہ رے صنم! یہ تری خود نمائیاں	ولہ	اس حسن چند روز پہ اتنا غرور ہے -
دم بدم اس کی خلش سے اب مجھے آزار ہے	ولہ	دوستاں یہ دل نہیں، پہلو میں میرے خار ہے
چاہ میں کس کی دل ڈبو بیٹھے	ولہ	آہ! ہم کیسے دل کو رو بیٹھے
کیوں امانی گیا نہ آخر دل		کفِ افسوس اب ملو بیٹھے
آہ اب میرے دم کے ساتھ ہوئی	ولہ	یا دو پر عمر کے برات ہوئی
ہم سا جو ناتواں عقبِ کارواں رہے	ولہ	جوں نقشِ پا وہیں کے ہوئے پھر جہاں رہے
صدمے جو پڑے ہیں دل پہ غم کے	ولہ	آنسو نہیں تھمتے چشمِ نم کے
خوش خواب میں ہیں، مگر جواب تک		جاگے نہیں خفتگاں عدم کے
ہے صبح کو عزمِ رفتنِ یار		ٹک نکلیو آفتاب تھم کے
آنکھیں نہیں مندتی ہیں عجب جی پہ تعب ہے	ولہ	یارب دل حیراں کو مرے کس کی طلب ہے

دم لینے نہیں دیتے ہیں ہم کے بینالے	وله	کیا جانیئے کیا دل کو مرے درد کہ ڈھب ہے
ہجراں کے شب و روز کا مت پوچھو گذرنا		دن کٹ گیا جوں توں کے، تو پھر رات غضب ہے
مت ہے سروکار غم ہجر سے ستی ہے		کچھ عیش سے تو کام نہ آگے تھا نہ اب ہے
نامہ بر کہیو زمانے کی تڑپ تھی تجھ بن	وله	شمع شب دیکھ مجھے صبح تلک روئی ہے
بارہا منع کیا چھوڑ دے بے رحم کی چاہ	وله	باز نہیں آتا، امانی بھی عجب کوئی ہے
سیر گلشن کو میں جاتا تھا جو صیاد مجھے	وله	دیکھ کر دور سے بولا کہ "شکار آتا ہے"

۱۴- امین

امین تخلص، خواجہ امین الدین نام، عظیم آبادی۔ عالم دوستی اور اتحاد میں باقرینہ ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم کے یار دیرینہ ہیں۔ شعر فہمی اور سخن رسی میں زمانے کے یادگار ہیں مضمون تراشی اور ادا بندی میں نادر روزگار ہیں۔ ذہن کو ان کے بندش کی صفائی میں نہایت ارجمندی ہے۔ اور طبیعت کو ان کی تلاش معانی میں اپنے ہمعصروں سے بلندی ہے۔ چند مدت نواب میر محمد رضا خاں مظفر جنگ بہادر کی رفاقت میں اوقات اُنہوں نے بہ کیفیت کاٹی ہے۔ بعد اس روزگار کے قناعت اور جواں مردی کے ساتھ خانہ نشینی میں زندگی بسر کی ہے۔ ایک دیوان چھوٹا سا زبان ریختہ میں ان کی تصنیف سے ہے۔ منتخب اس کا یہاں لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے +

دنیا میں جو آ کر نہ کرے عشق بتاں کا		نزدیک ہمارے ہے یہاں کا نہ وہاں کا
مانند نگیں آپ کی کاوش میں پڑا ہے		مشتاق جو کوئی ہے یہاں نام و نشاں کا
کرتا ہوں امیں میں تو ثنا اس کی و لیکن		منہ لال ہوا جاتا ہے خجلت سے زباں کا
پردے سے جو وہ شہرۂ آفاق نکلتا	طه	تب دیکھتے خورشید کا یہ نام نکلتا
تھا کچھ بھی مناسب کہ نکلوا دیا تو نے		گر صبح نہ نکلا تھا امیں شام نکلتا

بیشک رنج مکافات کے واسطے مامن ہے - یہ اشعار یادگار جریدۂ روزگار کے لکھے جاتے ہیں' اور یہ اوراق پریشان اس سے زینت پاتے ہیں +

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی — نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیحِ سلیمانی
ہنر پیدا کر اول، ترک کیجو تب لباس اپنا — کہ ہو جو تیغ بے جوہر اُسے ہے ننگ عریانی
خوش آمد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی — نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں شاہوں کی پیشانی
کُہے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی — ہوئی جب تیغ زنگ آلود کب جاتی ہے پہچانی
یہ روشن ہے برنگِ شمع ربطِ باد و آتش سے — موافق گر نہ ہووے دوست، ہے وہ دشمن جانی

ولہ

ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک — جوں شمع زندگانی مری ہے زباں تلک
ہے ماتم اس چمن میں نہیں خندۂ طرب — ہے کسوتِ کبود گلِ زعفراں تلک
لاف سپہ گری نہ سجے مرد راست باز — پاوے نہ راہ حرف زبانِ سناں تلک
سختی سے گذری اہل سعادت کی یہاں معاش — ہے منحصر غذائے ہما استخواں تلک

قطعہ تاریخ

جس کی بہار پہنچی نہ آخر خزاں تلک — آیا نہ ایک گل کبھی اس بوستاں تلک
وہ مرغِ ناتواں ہوں کہ صحنِ چمن سے میں — بے زور بال پہنچ نہ سکوں آشیاں تلک
روضہ میں جن کے حلقۂ چشمِ ملک سوا — پہنچا نہ پائے شمع کبھو شمعداں تلک
ہنگام طوف بسکہ ملائک ہمیشہ واں — لیتے ہیں خاک آن کے اس آستاں تلک
حلوم کھے ہیں وہاں کے یہ آپس میں دیکھ کر — پہنچے ہے کوئی دن کو زمیں آسماں تلک
رہنے کو جگ میں صورت افسوس کے تئیں — احکام خود می نے کیا منع یہاں تلک
انگشت چوسنے کے لئے طفل شیرخوار — ممکن نہیں کہ لا سکے اپنے دہاں تلک
اس چرخ دوں پرست تلے بہر شتِ جو — مانند آسیا کے پھروں میں کہاں تلک

قصیدہ

ہے سخن سنج اک جوانِ متیں
فخرِ صائب جو وہ کرے تحسیں

رات جا کر میں اُس کی خدمت میں
اُسے دیکھا تو تھا نپٹ غمگیں

میں جو پوچھا؟ کہا سبب مت پوچھ
خبث کرنا کسی کا خوب نہیں

لیکن اے یار تجھ سے کہتا ہوں
دل کے گو مجھ پہ سب کریں نفریں

داغ ہوں ان سے ابتدائی میں
بزمِ شعرا سے ہیں جو صدر نشیں

یعنی سودا و میر و قائم و درد
لے ہدایت سے تا کلیم و یقیں

کیا غرور و دماغ و کیا نخوت
کون سا کبر ہے جو اُن میں نہیں

شاعرِ شیرہ کتاب تھے
سمجھے ہر ایک اپنی چینِ جبیں

تنگ جائیں جو بزم کا اُن کی
بو علی ہو صفِ نعال نشیں

اور جو احمق ان کے سامنے ہیں
دم بدم اُن کی کیا کریں تحسیں

جیسے بیٹھا ان من ترانی پر
لڑکے کمبخت کہتے ہیں آمین

شعر و تقطیع ان کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقشِ نگیں

اُس میں جو دیکھئے تو آخر کار
یا توارد ہوا ہے یا تضمیں

اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں
ہیچ در کون آسمان و زمیں

غرض ان خبث کے تئیں تج کر
ہو سکے بے اختیار دیں و دہیں

کہا سودا کو ان بزرگوں میں
مت گنو اُس کا ہی کب آئیں

اور جو ہووے بھی تو لائق ہے
فخر کرنا جسے ہے اُس کے تئیں

ہے وہ مداح ایک ایسے کا
مسند جاہ جس کی عرشِ بریں

یعنی نواب سیف دولہ سدا
جس کی شمشیر و فرقِ دشمن دیں

رفعتِ دستِ جود سے جس کے
دامن خلق کا ہے یہ آئیں

پنجۂ آفتاب کی سی طرح
بہرہ ور ہے ہمیشہ روئے زمیں

غنچہ کی بھی گرہ میں بند کیا
تیری بخشش نے مشتِ زر کو تئیں

دست دریا نے گم کرے ہی عدو
یاد کر تیری تیغ و خنجر کیں

پوچھتا ہے ہر ایک سے یہ کہ
سرِ ما تنکڑیوں میں ہے کہ نہیں

فکر میں قہر کے ترے ہر شب
حالت نزع سے زبس ہے قریں

نیند اُس کو نہ آوے تا نہ پڑھیں
جائے افسانہ سورۂ یٰسیں

احکام پر ترے نہ کرے کیونکر کام تیر
ہے یہ کمان حلقہ بگوش و غلام تیر

اُتنا ہی چست بیٹھے ہے جتنی کماں ہو چست
خوبی کا حق کرے ہے ادا یہاں تمام تیر

ہمسر ہے کس کا تیر ترے تیر سے کہ یہ
انگشت ہے قضا کی کہیں ہیں بنام تیر

شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زبان ہے

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے میں کئی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ مکاں ہے

ثابت ہے جو ڈھیلا تو نہیں موزوں میں کچھ جان
تیر دوں میں ہے پیگیری تو بے چلہ کماں ہے

کہتا ہے نفر عزت کو صراف سے جا کر
بی بی نے تو کھایا ہے یہ فاقہ سے میاں جی

یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ
شوال بھی چو ماہ مبارک رمضاں ہے

اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
تنخواہ کے پھر ملنے کی یہ شکل کہاں ہے

لیتے ہیں بایں سعی ہی وہ تو دو ماہہ
تک صورس دمڑکے کی جنہیں تاب و تواں ہے

قاضی کی جو مسجد ہے کہ علا نمہ کے اس میں
بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے

ملّا جو اذاں دیوے تو منہ موند کر اس کا
بولا جو خطیب اس میں تو مارے اسی اک ہول
رینگے ہی گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے
اور وہ جو ہیں کم مور سو وہاں آن کے بیٹھو
اُٹھ اُٹھ کے دکھانے ہیں انہیں حال وہ اپنا
پور بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پال کے آگے
کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کسی کا چاک
ہندو و مسلماں کو پھر اُس پال کے اوپر
یہ مسخرگی دیکھ کے وہ صاحب اجی
گو ہوجئے جا کر کسی عمدے کے مصاحب
وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو
خمیازہ پہ خمیازہ ہی اور جھرت اوپر جرت
صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
صحبت ہے یہ اُس سے اگر آقا کے تئیں چھینک
دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اُس کے
سوداگری کیجے تو ہے اُس میں یہ مشقت
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ شالث
گر خان و خوانین کی کہے کوئی وکالت
ہر گھر میں وہ چاہے کہ میں قلعہ سا چھوڑوں
شاعر ہوئے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانا

کہتے ہیں کہ خانہ وش مسلمانی کہاں ہے
ہاتھ آگیا واعظ تو تھپیڑا یہ وہاں سے ہے
نہ ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے
رستے کے جو آگے کو یہ ہر ایک دکاں ہے
دربار رو اس عہد میں جو خورد و کلاں ہے
اس سج سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے
کوئی دے ہے منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
ارمتی کا تو ہم سے ہے جبارے کا گماں ہے
کرتا ہے جو وہاں عرض تو نہ یہاں ہی نہ وہاں ہے
اس کی تو اذیت بڑی ہی آفت جاں ہے
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
منہ صورت سوفار کمر شکل کماں ہے
سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے
آوے تو وہ اُس کو یہ خشونت نگراں ہے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
سمجھے ہے فروشندہ یہ دندی کا گماں ہے
اس کا تو بیاں کیا کروں تم پہ عیاں ہے
ہر کوچہ میں جوں آب چکاں یا درواں ہے
دیکھے جو کوئی فکر و تردد تو یہاں ہے
بیت قطعہ تہنیت خلق زباں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر — گر رحم میں بیگم کے سنے نطفہ نہاں ہے

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ اس کا — پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

ملانی اگر کیجیے تو ملا کی ہے یہ تصدیع — ہوں دو روپے اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے

دن کو تو وہ بیچارہ پڑھایا کرے لڑکے — سب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے

تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اس کے — لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت — چھٹتے ہی تو شعر کے وہ مطعون زباں ہے

دیتا ہے دُم خرس سر کوئی شملہ کو نسبت — گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہیچ کو اکثر — ہے آج کدھر عرش کی شب بو نہ کہاں ہے

تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی — لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

در ہجو اسپ بخیل

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار — رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے — ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے — موچی سے کفش پا کو لگاتے ہیں وہ ادھار

تنہا وے نہ دہر سے عالم خراب ہے — خست لئے انگلیوں میں اٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں — پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے حمار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے — گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو ایسا خراب و خوار

نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نے سئیس — رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیرخوار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا — ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

ناطاقتی سے اس کی کہاں تک بیاں کروں — فاقوں کا اس کے ہائے کہاں تک کروں شمار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال — کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھ کو کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

جس دن سے اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے
گذری ہے اس نمط اسے ہر لیل و ہر نہار

ہیہات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار

خط شعاع کو سمجھے ہے وہ دستۂ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا
چھکے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے وہ پسار

دیکھے ہے جب وہ توبرۂ ٹھاں کی طرف
کھاتا ہے دانہ گھاس کی جا گہ سدا بچار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑے کو دیکھتا ہے تو بادی ہے بار بار

نے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے اپنی دم کو کہ جوں کھال کو لہار

پیدا ہوئی ہے پشت پہ اگن پاؤ اس قدر
ہرگز دروغ اس کو تو مت جان زینہار

گذرے وہ جس طرف سے کبھو اس طرف ستی
باد سموم ہووے صبا گر کرے گذار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سُرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی بس اعتبار

یہ حال اس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
چنگل سے موذی کی تو چھڑا اس کو کردگار

یا مر رہے یا چور لے جاوے یا ہووے گم
اس تین بات سے کوئی بھی ہووے آشکار

تنہا نہ اس کے غم سے ہے دل تنگ تنگ زیں
خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار

القصہ ایک دن مجھ کو کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا
مشہور تھا جنہوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں ان کے میں نے کیا جا کے التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا تب انہوں نے کہ اے میری جان من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم اوپر نثار

لیکن کسی کی چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار

صورت کا جس کی دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ
سیرت سے جس کی نت ہے سگ خشکیں کو عار

بدرنگ جیسے لید ہی بدرنگ جوں پیشاب
بدبو میں اس قدر کہ کرے اصطبل اجاڑ

مانند میخ چوکی لکڑی سے ہے تھان پر
لاجنبش لے جگہ نہیں جوں میخ استوار

حشری ہے اس قدر کہ قیامت کہیں اوپر
دجّال منہ کو اپنے سیہ کرکے ہو سوار

اتنا ہی سرنگوں ہے کہ سب گر گئے ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہے مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلا دے اُسکا سن
پہلے وہ ملے کے ریگِ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھ زمرے تو ایسا یاد ہے
شیطاں اُسی پہ نکلا تھا جبکہ ہوا سوار

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اُس کی نعل کا
لوہا منگا کے تیغ بنا دے کبھی لہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا وہ زینہار

ٹھٹّا نو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں نہ یار

دلّی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آ کر یہ وقتِ کار

مدت سے کوڑیوں کو اُڑاتے ہو گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اُس پہ زین
ہتیار باندھ کر میں ہوا اُس اُوپر سوار

جس شکل سے سوار تھا اُس دن میں اس اوپر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھی دونوں ہاتھ میں پکڑی تھا منہ کے بیچ
تسمہ میخ کے پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبڑا اسے دکھلائے تھا نفر
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ آتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا جگہ سے تئیں جوں میخ استوار

اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبر اُن میں سے کہتے تھے یوں پکار

پیچھے اسے لگا دو کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھ پہ اس کے دو اختیار

کہتا تھا کوئی ہے یہ گھوڑا نہیں ہے یہ سب
کہتا تھا کوئی ہے یہ ولایت کا یہ حمار

پوچھے تھا کوئی مجھ سے ہو تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ کیا کیوں تجھے سوار

گھر مرے آنا اگر منظور تھا
ولہ آئے ہوتے لطف سے کیا دور تھا

گالیاں جو دیں سو دیں اب بس کیجئے
سن چکے ہم جب تلک مقدور تھا

ولہ
یہ دل خالی نہیں کوئی دم رہے گا
تو جاوے گا تری غم رہے گا

ولہ
جس کا دل آپ نے لیا ہوگا
خاک میں لے ملا دیا ہوگا

ہم کو کیا، اگر بہار آتی ہے
دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا

گالیاں غیر سے سناتے ہو
ہاں میاں! تم سے اور کیا ہوگا

ل گیا ہوگا خاک میں جوں اشک
تیری آنکھوں سے جو گرا ہوگا

ولہ
بتاں کے واسطے گھر بار کو اپنے بہا نکلا
یہ طفل اشک میرا عاشقی میں بے بہا نکلا

ولہ
وہی مقصود دل ہے، اور وہی منظور آنکھوں کا
سرور سینہ میں اس کو کہوں، یا نور آنکھوں کا

ولہ
کیا ایک مجھ کو بھاتی ہے برسات کی ہوا
کس کو نہیں خوش آتی ہے برسات کی ہوا

جب آہ سرد بھرتا ہوں کانپے ہے تن امیں
جوں شاخ کو ہلاتی ہے برسات کی ہوا

ولہ
خورشید ترا دیکھ کے منہ کانپ کے نکلا
مہ چادر مہتاب میں منہ ڈھانپ کے نکلا

ولہ
شور ہے عالم میں تیرے حسن عالم گیر کا
تو ہی ہوگا گر کوئی ہوگا تری تصویر کا۔

عشق کی دولت سراپا میں طلا کے رنگ ہے
اے ہوس دیکھ لے نسخہ ہے یہ اکسیر کا

چوستا ہے جوں سر پستاں کو طفل شیرخوار
چابتا رہتا ہے دل پیکان اس کے تیر کا

ولہ
گر ارادہ نہیں ہے آنے کا
فائدہ اس قدر بہانے کا؟

خط نے مارا ہے حسن پر شب خوں
کیا ہی جھگڑا ہے سوا شکا

ولہ
سخت کاوش میں ہوں بہ تنگ نگیں
ایسی نام آوری کا منہ کالا

ولہ
دل مرا سینہ سے یوں لیتی ہے وہ زلف دوتا
اپنے دیوانوں سے کیا رکھتی ہیں یہ زنجیر کھینچ

دیکھتی ہے جب مری صورت کو بل کھاتی ہے زلف
جس طرح مجمر سے لے اخگر کو آتش گیر کھینچ

ولہ
جس طرح شاخ کو ہوتا ہے ثمر سے پیوند
کاش نالے کو مرے ہوئے اثر سے پیوند

کہنے لگا یہ آکے اُس اجماع میں ایک شخص
گھوڑا نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

بھول ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈاین چلے ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک دسا
فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے دو چار

دھوبی کمہار کی گدھی اُس دن ہوئی تھی گم
اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے وہاں گذار

ہر اک نے اُس کو اپنی گدھی کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار

دریائے کشمکش ہوا اُس آن موج زن
تھا عنقریب ڈوبنے خفت کے یک کنار

بلد پشمی اُس کی دیکھ کے کر خرس کا خیال
لڑکے بھی وہاں تھے جمع تماشے کو بیشمار

کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دوں گا ٹکا میں تجھ کو بھی تو چندہ ایتوار

بکتا تھا کوئی تھالا کے سپاہی کو منہ کی بیچ
لیتا تھا کوئی دوڑ کے مو تن سے تی اکھار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اُس کے گرد و پیش
ساتھ اُس سمند خرس نما کے ہو چشم چار

جھگڑوں میں دھوبیوں کے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار

پہلی ہی گولی چھوٹتے اُس گھوڑی کو لگی
ایسا لگے نہ تیر کہ ہووے متن سے پار

بارے دعا مری ہوئی اُس وقت مستجاب
وہاں سے بہر نمط کیا خجگاہ تک گذار

یہ کہ کے حق تنی میں ہوا مستعد بہ جنگ
اتنے میں مرہٹہ تھی ہوا مجھ سے بھی دوچار

گھوڑا تھا بسکہ عاجز و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اُس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں ہو بغل میں سوار

جب میں نے دیکھا جنگ کی یہاں تو بند ہے محل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

مقدور نہیں اُس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعین کے درِ دل سے اُٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمع حرم رنگ جھلکتا ہے بتاں کا

یاالٰہی کسی ظالم کے پڑے پنجہ میں		بے طرح پشکہ کو ہے اُس کی کمر سے پیوند
دیکھ بھال اس دل صد چاک کو لیتے ہیں جب		میں نے یہ شیشہ کیا کیا ہے ہنر سے پیوند
مرتے ہیں ہم تو اُس کے لب آبدار پر	ولہ	گر آب زندگی ہو تو مارے ہیں دھار پر
بوسہ دیا تھا، جی میں جو آوے تو پھیر لو		اتنا خفا ہو کس لئے اس خاکسار پر
اس شمع رو کے سامنے آتا ہے تو پتنگ		بھاری ہوئے ہیں کیا تجھے اپنے دوچار پر
دب نکلتا ہے اگرچہ سب سے ہے بالا پہاڑ	ولہ	دیکھتا ہے جب ہماری آہ کا کالا پہاڑ
کھودیا کوہ کن نے جاں شیریں کے لئے		اس کی فرمایش کا اپنے سر سے تو ٹالا پہاڑ
آ دیکھے تری زلف گرہ گیر ہوا پر	ولہ	جن نے نہ کبھی دیکھی ہو زنجیر ہوا پر
ڈر سے ترے نالہ بھی نکلتا نہیں لب سے		ظالم ہے ترے ظلم کی تاثیر ہوا پر
اُڑتا ہے ہو کے مضطر جا اس کے بام و در پر	ولہ	نامہ مرا کہاں ہے ہے کاغذی کبوتر
ہے نہیں جوہر نمایاں تیغ تیز یار پر	ولہ	لکھ رہا ہے نام مقتولوں کا اس تروار پر
یار کے مژگاں سے لڑ جاتی ہے یوں تیر نگاہ		جس طرح تروار کوئی آ لگے تروار پر
دل خیال زلف میں بے خواب و بے آرام ہے		رات ہوتی ہے ایمن بھاری ہر اک بیمار کو
آئی بہار ہو گئے ہر خار راہ سبز	ولہ	لیکن ہوئے نہ آہ یہ بخت سیاہ سبز
شاداب ہے خط اس کے لب آبدار پر		رہتا ہے گرد جادہ کے اکثر گیاہ سبز
دل میں ترے خیال ہے کس نونہال کا		لب سے ایمن نکلتی ہے ہر ایک آہ سبز
یار آیا ہے اب نہ یہ اے چشم	ولہ	دیکھنے دے ذرا تو رہ اے چشم
کیا کہوں یار سے اپنی سی کئے جاتا ہوں	ولہ	گالیاں کھاتا ہوں غصہ کو پئے جاتا ہوں
جی نکلتا ہے، یہ لب یاد میں ہلتے ہیں تری		مرتے مرتے بھی ترا نام لئے جاتا ہوں
چاک سینہ کا مرے لوگ عبث سیتے ہیں	ولہ	ہم تو زخمی ہیں نگاہوں کے، کوئی جیتے ہیں

ملاحظہ: آب زندگی سے "آب حیات" مراد ہے جس پر خضر کا قبضہ کہا جاتا ہے ۱۲

سیل آتی ہے تو آنے دو مرا کیا لے گی		گھر میں ایک میں ہوں پڑا، اور کئی بستے میں
فائدہ کیا ہے بھلا ہم جو کریں فکرِ معاش		غم کو کھاتے ہیں امیںؔ خون جگر پیتے ہیں
سر پہ خوباں جو بال رکھتے ہیں	ولہ	مو بمو جی کا کال رکھتے ہیں
سرو پر اتنا بھول مت قمری		ہم بھی اک نونہال رکھتے ہیں
دل تو کیا ہے، امیںؔ جو آوے یار		جان آگے نکال رکھتے ہیں
بتاں مجھ سے کہتے تھے کیا کچھ نہیں	ولہ	ولیکن جو دیکھا، تو تھا کچھ نہیں
میں بوسہ جو مانگا، جو جھنجلا کے وہ		لگا کہنے کیا ہے، کہا کچھ نہیں
مجھے بے چین رکھتا ہے دل افگار پہلو میں	ولہ	وہ سوئے کس طرح جس کے رہے بیمار پہلو میں
گرفتاروں کو تیری زلف کے کس طرح خواب آوے		بسانِ شانہ رہتا ہے اُنہوں کے خار پہلو میں
مجھے تو کبھی عمر بھر غم نہ ہو	ولہ	ملاقات تیری اگر کم نہ ہو
میں درگذرا صاحب سلامت بھی		خدا کے لئے اتنا برہم نہ ہو
ہم آنے کو مانع نہیں غیر کو		پر اتنا بھی خلوت میں ہر دم نہ ہو
امیںؔ کی غذا آرہی ہے یہی		الٰہی یہ خونِ جگر کم نہ ہو
ہوئی ہے آشنائی جب سے اس مے نوش سے مجھ کو	ولہ	جو صاحب عقل ہیں کہتے ہیں اہلِ ہوش سے مجھ کو
بھلا تو ہی کہہ اسے دل کسی کو یہ توقع تھی		نکالے گا وہ صبح عیدیوں آغوش سے مجھ کو
جدائی سے سراپا رنگ میرا زعفرانی ہے		کوئی لے کر ملا دے اس بسنتی پوش سے مجھ کو
بھڑکتا ہے جگر میرا دل پر داغ کے دولت		امیںؔ جلنا پڑا اس آتشِ خاموش سے مجھ کو
کیا کہیں دودِ آہ کی تاثیر	ولہ	گھر کا گھر ہے سیاہ، مت پوچھو
مفت مارا گیا ہزار افسوس		تھا امیںؔ بے گناہ مت پوچھو
جب دکھاتا ہے وہ شرابی آنکھ	ولہ	وہ نہیں جاتی ہے گلابی آنکھ
لختِ دل گتھ رہیں ہیں مژگاں سے		ہے مگر خانۂ کبابی آنکھ

ہاتھ اٹھاتا جان سے پیارے نہیٹ دشوار ہے		کیوں نہ دیکھا کل سبھی تو ناز برداروں میں تجھے
بھر عمر گدائی میں بھی کرتے رہے شاہی	ولہ	دنیا میں جو ٹھاٹھ نہ تھے یہاں، ہم نے نباہی
خط کو جو تراشے ہے بھلا فائدہ کیا ہے		اب چڑھ چکی اے یار سپیدی پہ سیاہی
کیا دین سے غافل ہیں ایسی مردم دنیا		سکہ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا الٰہی
تمہاری آنکھیں جو دیکھتے ہیں بہت ہی لگتی ہیں بھولی پیاری	ولہ	پر اس قدر ہیں جو خوں کی پیاسی یہ کافر آنکھیں ہیں یا کٹاری
تری نگہ کے جو ہم ہیں گے مارے، نہ مانگا ہو گا انھوں نے پانی		نہ ایسی دیکھی ہے تیغ ہم نے، نہ ایسی دیکھی ہے آبداری
اظہار نہیں اگرچہ سر کا	رباعی	پر بوجھ اتاروں ہوں میں اپنے سر کا
سائل کو جواب ترش ہرگز مت دے		بھوکا ہے، کیا کرے گا لے کر سرکا
یہ جور و جفا یہ بے وفائی کب تک	رباعی	بس کیجئے، پاس آشنائی کب تک
کرتا ہے کوئی حسن پر اتنا بھی غرور		دیکھیں تو رہے ہے یہ خدائی کب تک
کیا شہر میں آج مجھ پر ہے ہولی-	رباعی	پھرتے ہیں لئے عبیر بھر بھر جھولی
وعدے سے کیا کرو گے دل خوش کب تک		ہولی کا قرار تھا سو یہ بھی ہو لی
ایک ہیں آشنا مرے غم خوار	مثنوی	پوچ گو بیوقوف بد اطوار
ان کی تعریف کیا کروں میں بیاں		کہتی شرماتی ہے گی منہ میں زباں
دل ہے ان کا کہیں دماغ کہیں		گھر میں ڈھونڈو تو بھونی بھانگ نہیں
منہ کو ان کے خدا نہ دکھلاوے		گر کوئی دیکھے خاک کیا کھاوے
چار پیسے کا سیر بھر ٹھرّا		پی کے رکھتے ہیں جی میں یہ غرّا
آج دنیا میں ہیں جو کچھ ہم ہیں		مالکِ چار دانگ عالم ہیں
دیکھتا ہوں جو ان کی میں صورت		یاد آتی ہے چین کی مورت
گال جبڑے سے یوں رہے ہیں لپٹ		لگ رہے ہوں کواڑ کے جوں پٹ
تس پہ چیچک نے یوں ہے ماری میخ		جوں جڑی ہوں کواڑ میں گل میخ

میں تو کرتا نہیں سخن چینی — ناک ہے جوں کواڑ کی بینی
آنکھ گر ہے تو گھر سے باہر ہے — حلقۂ چشم حلقۂ در ہے
کان ایسے پڑے ہیں دونوں طرف — جوں ڈفالی کا ہووے پھوٹا دف
منہ ہے سنڈاس کی طرح بدبو — لوگ کرتے ہیں دیکھتے اخ تھو
ان کے دھانے کو دیکھ کر فی الحال — جن کے دیکھے نہ ہوویں کالے بال
دیکھ نقاش اس کی پیشانی — کھینچتا دل میں ہے پشیمانی
کھوپڑی سر سے ہے گی یوں اٹکی — جوں کہ چوٹھے پہ اوندھی ہو مٹکی
توند لٹکے ہے پیٹ سے ایسی — پیٹ سے ہووے پیٹ سے جیسی
صاف کہتا ہوں میں بہ مجبوری — ناف ہے جا ضرور کی موری
کیا کہوں اس کی اور بد حالی — منہ ہے چکنا تو پیٹ سے خالی

دل لیکے زلف اس کی یوں حلقہ زن ہے مجھ پہ — ولہ — بیٹھا چمن میں ہووے جوں سانپ من کے آگے

بتاں اٹھاتے نہیں ہاتھ میرے کینہ سے — ولہ — رہے ہے سنگ کتیں لاگ آبگینہ سے
ضرور کیا ہے کہ ہوتا ہے تو خجل ناصح — ہماری جیب کو ہے کیا لگاؤ رہنے سے
نہ اٹھ سکے گا مرے لب سے حرف بوسہ کا — مٹا سکے ہے کوئی نام کو نگینہ سے
امیں ضعیف میں اتنا ہوا بقول فغاں — اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینہ سے

کیا برا وقت تھا اس شوخ سے جب آنکھ لگی — ولہ — جب تلک جیتے رہے روز نہ شب آنکھ لگی
بزم رنداں میں اسے دیکھ کے چھپ جاتے ہیں — کیا مگر شیخ کی ہے بنت عنب آنکھ لگی

میں گندا یار کے ملنے سے جاؤ جس کا جی چاہے — ولہ — غرض اشتیاق سے عاشق کہاؤ جس کا جی چاہے
حیات جاوداں بخشے ہے تیغ آبدار اس کی — اگر باور نہ آوے آ کے کھاؤ جس کا جی چاہے

یار بھی اب گلہ لگا کرنے — ولہ — یہ بھی اپنے نصیب کی خوبی
ہاتھ میں اپنا سر لئے رہنا — عشق کی پہلی یہ سلامی ہے

دل گرفتار کیوں نہ ہو میرا ۔ بر میں جامہ ترے وہ دامی ہے

ولہ

زاہد کبھو تو گرد نہ پھر یو شراب کے ۔ یہاں آگ ہے چھپی ہوئی پردے میں آب کے
کیا چشم منعماں سے رکھیں مفلسانِ دہر ۔ دریا نے تو بھرے نہیں کاسے حباب کے

ولہ

پھرتا ہے کیوں بھٹکتا اے شیخ ہر طرف تو ۔ کہتا ہے جس کو کعبہ وہ یار کی گلی ہے

ولہ

کہا کرتے ہو مجھ کو قابل جور و جفا یہ ہے ۔ جو کوئی چاہے کسی کو اسے میاں اس کی سزا یہ ہے
برہمن دیر کو پوجے ہے اور کعبے کے تئیں زاہد ۔ پرستش ہم جسے کرتے ہیں، وہ نام خدا یہ ہے

ولہ

رشک گلزار ہوا داغ سے سینہ میرا ۔ یار کے بھاویں تماشا ہے، تماشا یہ ہے

ولہ

اس ماہ رو کے سامنے آتی ہے چاندنی ۔ اپنے تئیں اب آپ ہنساتی ہے چاندنی
منہ دیکھو تیرے سامنے آکر سفید ہو ۔ پانی میں آبرو کو ملاتی ہے چاندنی
ہو دو دن کی چاندنی ہے پھر آخر اندھیری رات ۔ ساقی پلا شراب کہ جاتی ہے چاندنی
گر آمد آمد اس مہ تاباں کے تئیں ایں ۔ کیوں چاندنی کا فرش بچھاتی ہے چاندنی

ولہ

غیروں سے اختلاط ہماری بلا کرے ۔ گر آشنا کرے تو تجھی سے خدا کرے
دنیا میں کہنے کو سب ہی کہلاتے ہیں بھلے ۔ پہ ہے وہی بھلا، جو کسی کا بھلا کرے

۱۵۱ افسوس

افسوس تخلص، میر شیر علی نام، والد ماجد ان کے سید مظفر علی خاں، داروغۂ توپ خانۂ نواب میر قاسم خاں عالیجاہ کے تھے۔ سلسلہ سیادت کا ان کی حضرت اسمعیل اعرج کو، کہ بڑے بیٹے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے تھے، پہنچتا ہے۔ وطن بزرگوں کا خواف ایک مکان ہے علاقہ میں عرب کے۔ بزرگوں نے ان کے ہندوستان میں آکے نارنول میں سکونت اختیار کی۔ اس سبب سے وطن ان کا نارنول مشہور ہے۔ میر مذکور کے باپ اور چچا کو، کہ سید مظفر علی خاں اور سید غلام علی خاں نام رکھتے تھے، نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم

گیارہ برس ان کے متعینہ رہے۔ بعد برہم ہونے اس سررشتہ کے، صاحب عالم وعالمیان میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کی عنایت اور قدر دانی از بسکہ حد سے زیادہ تھی، سعادت توسل کی انہوں نے ملازموں میں اس عالی جناب کے حاصل کی جس ایام میں اس نیر اوج شہریاری کا خیمہ مغرب کی سمت نکلا، اور کوچ شاہ جہان آباد کو ہوا، تو میر مذکور بہ سبب بعضے بعضے عوارض کے رہ گئے، اور ساتھ نہ جا سکے۔ ایک مدت سے توکل و قناعت بھراہی میں نواب سرفراز الدولہ بہادر کے دن زندگی کے بسر کر رہے تھے کہ جناب والا مناقب عالی شان بارلو صاحب نے، مشورے سے عالی قدر سخن آفرین مسٹر گلکرسٹ صاحب، زبان دان ریختہ لکھنؤ سے طلب کیے۔ بڑے صاحب نے لکھنؤ کے، کہ نامی اس معدن رافت کا ہر صاحب ہے، بہ عزت تمام ان کو بلوا کے، اور مشاہرہ دو سو روپے کا ٹھہرا کے، پانچ سو روپیا خرچ راہ دیا، اور کلکتے کی طرف روانہ کیا۔ چنانچہ جب مرشد آباد میں یہ آئے، تو دو فور محبت سے اسی دن غریب خانہ میں تشریف لائے، کس واسطے کہ ان کے نکلنے کی تقریب سے دو مہینے آگے راقم حقیر لکھنؤ سے نکلا تھا، اور وارد وہاں کا تھا، دیدار سے اپنے انہوں نے نہایت خوش و خرم کیا، اور چلتے ہوئے وعدا کلکتے کی سیر کا اس عاصی سے لیا۔ غرض بالفعل کہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بلدہ کلکتے میں، صاحبان عالی شان کے ساتھ میر مذکور ملاقاتیں بہ عزت تمام رکھتے ہیں۔ اور گلستاں کے ترجمہ کا کمپنی کی سرکار سے کام رکھتے ہیں۔ راقم آثم سے ملاقات ایام شباب سے ہے۔ فی الحقیقت کہ ذات ان کی زمانے کے اعجاب سے ہے عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فروتنی اور انکساری میں فرد کامل ہیں۔ منطق و معانی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں۔ کلیات اور معالجات فن طبابت کے بھی بخوبی یاد ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں۔ اقسام نظم ہیں +

کیوں نہ ہو گھمنڈ اس بت پر غرور کو
اس بے حجاب کا دیویں ابھی اٹھا نقاب

باقی نہیں فقط ہنیدوی ہے سب کی زیب
سچ ہیں خود نمائیاں، حق ہیں یہ لن ترانیاں

صبر کسی طرح نہیں اس دل نا صبور کو
دیکھ سکے گا پرا سے تاب ہے اتنی طور کو

دیکھنا آج ہم نشیں آنسوؤں کے نور کو
شعلۂ طور دیکھ گیں دیکھ کے اس کے نور کو

کی رفاقت میں سررشتۂ ملازمت کا نہایت اقتدار، اور عز و وقار کے ساتھ توپ خانے کی
داروغگی کے ساتھ سرفراز تھے، اور رسالہ معقول سے حضور میں مختار تھے۔ بعد شہید ہونے نواب
عمدۃ الملک کے سید غلام علی خاں کو نیابت صوبہ الہ آباد کی بالذات بھی تھوڑے دنوں رہی
آخر فالج بیماری سے انہوں نے سیر روضۂ رضوان کی کی۔ ان کی وفات کے بعد سید مظفر علی خاں
خانہ نشین ہوئے، اور بارہ برس بے روزگار بیٹھے رہے۔ آخر نواب خان عالم بقا ہمت خاں
مرحوم نے لکھنو میں انہیں بلوایا، اور سرکار وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کے شامل
میں تین سو روپے کا واسطے ان کے درماہہ ٹھہرایا۔ ان ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن
گیارہ برس کا یا کچھ کم زیادہ ہے، لیکن مولد ان کا دارالخلافہ شاہ جہان آباد ہے۔ یہ بھی ہمراہ
اپنے والد ماجد کے لکھنؤ میں آئے، اور طور بود و باش کا یہیں ٹھہرائے۔ بعد کئی برس کے حسب الامر
نواب صادق علی خاں کے، کہ بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خاں صوبہ دار بنگالہ کے تھے، سید
مظفر علی خاں وارد مرشد آباد ہوئے، اور داروغگی توپ خانہ وغیرہ کے ساتھ مورد عنایت
و امداد ہوئے۔ آگے بیان ساتھ تفصیل کے بموجب طول کلام کا ہے۔ غرض جب وزیر الممالک نواب
شجاع الدولہ بہادر معہ صوبہ دار بنگالہ صاحبان عالی شان سے معرکہ آرا ہیں، تو سید مظفر علی خاں
بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ بعد میر محمد جعفر خاں کی وفات کے روزگار نواب سیف الدولہ کا انہوں
نے نہیں کیا، بلکہ لکھنؤ چلے آئے، اور بعد کئی برس کے حیدر آباد کی طرف گئے، وہ وہیں وصال ان کا
ہوا۔ اس ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن اُنیس ۱۹ برس کا تھا۔ شعر و سخن کے ساتھ موانست
ان کو بشدت تھی، اور طبیعت کو مناسبت نہایت۔ چنانچہ صغر سن سے شعر کہتے ہیں، اور اکثر
اس شغل میں رہتے ہیں۔ اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیران تخلص سے ہوا ہے، اور
علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاگرد ان کو میر حسن حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی سند اپنے تئیں
نہیں پہنچی، اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی۔ ابتدا میں یہ سررشتہ روزگار کا نواب سالار جنگ
مرحوم کے ملازموں میں رکھتے تھے۔ اور میرزا نوازش علی خاں، جو نواب مذکور کے بڑے بیٹے ہیں،

تازہ پھرا وہ منہ، گر دیکھے جو اک نظر تو پھر — منہ پہ نہ لائے زاہدا بھولے سے ذکرِ حور کو
دو کسو نہ طعنہ زن مجھے ناکسوں کی خوشامد — میں نے نہی کی نہیں فقط، کرتے ہیں سب ضرور کو
تو نے افسوس کیا کیا۔ دشمنِ جاں کو دل دیا — یہ تیری عقل جل بجھے، آگ لگے شعور کو

ولہ
سمند گرم جو یہاں اس سوار کا پہنچا — غبار تا فلک اس خاکسار کا پہنچا
تو سچ بتا کہ تجھے اتنی کیوں ہے بے چینی — مگر پیام کسی بے قرار کا پہنچا
ملے ہے پانو سے اپنے وہ لالہ بھر دم — یہ مرتبہ تو دلِ داغ دار کا پہنچا
ہے یہاں تلک تو نزاکت کلوں کے گجرے سے — لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا
قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس — حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

ولہ
جب تلک عشق یار و، نہ دل ناکام تھا — اپنے میں کیا چین تھا، اور دل کو کیا آرام تھا
بخشیو ہم کو تمہے ٹوکا ہے ہم نے بھول کر — دردِ دل تیری بلا ہو، وہ ترا ہمنام تھا

ولہ
اس کے اٹھتے ہی جی پہ آن بنی — دیکھئے آگے آگے کیا ہوگا

ولہ
صبح نت کرتا ہے یہ دل اشکباری بیشتر — ہو سحر کو خانۂ ماتم میں زاری بیشتر
دل کے تئیں بھی آشنائی کا نہیں کچھ اعتبار — بے وفاؤں سے رہی ہے تجھ کو یاری بیشتر

ولہ
ہنس کر کسی سے میں نے نہ کی بات تجھ بغیر — روتے ہی آہ کٹ گئی یہ رات تجھ بغیر
غیروں سے تو ملے تو ملا کر، و لے مجھے — کرنی نہیں کسی سے ملاقات تجھ بغیر

قطعہ
بزم میں اس کی نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں — چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں

ولہ
کہا میرا مطلق نہیں مانتا ہے — تو جیسا ستاتا ہے جی جانتا ہے

ولہ
کوئی دل سے مرے پوچھے جیسا کہ وہ آئے ناصح — مجھ کو خوش آئے یہ، پر مجھ کو تو بھاتا ہے

۱۶- آشفتہ

آشفتہ تخلص، حکیم رضا قلی خاں نام، والد ماجد ان کے حکیم محمد شفیع محمد خاں مرحوم تھے،

متوطن اکبر آباد کے ۔ بڑے بھائی ان کے میرزا جو صاحب ، خدا مغفرت کرے ، ذرہ تخلص کرتے تھے عجب ولولے اور ذوق شوق کے ساتھ کربلائے معلٰے گئے ، اور وہیں خاک ہوئے ، روضۂ ضریح مقدس کے دفن ہیں ۔ حق سبحانہ تعالےٰ حشر بھی ان کا ، اور جمیع مومنین کا ، جناب سید الشہدا علیہ السلام کے ساتھ کرے ۔ دوسرے بھائی ان کے ، میرزا رضی صاحب ، وہ بھی ان سے بڑے ہیں ، بالفعل لکھنؤ میں داد طبابت اور معالجے کی دے رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جو جو اختراعات فن طبابت میں انہوں نے کئے ، دیکھنے کا کیا دخل ہے ، کسی نے نہیں سنے ۔ حذاقت اور لیاقت ان کے خاندان کی نہیں ہے محتاج تشریح اور بیان کی ۔ ہمیشہ بزرگ ان کے معالج سلاطین نامدار کے رہے ہیں ، اور امیروں سے بلکہ وزیروں سے سدا ناز و اعزاز کیا کئے ہیں ۔ غرض حکیم رضا قلی خاں آشفتہ تخلص راقم آثم کے دوستان قدیم سے ہیں ۔ جوان آزاد وضع ، اور خوش اختلاط وارستہ مزاج ، اور بابۂ ارتباط میں محبت ، اور یکرنگی میں خلاصے ، اور آشنائیوں کے بہت خاصے ، حسن پرستی میں خود لیلی و شیریں کی تصویر ، اور عشق بازی میں قیس و فرہاد کے پیر ہیں ۔ مشورہ سخن کا انہوں نے میر سوز صاحب سے کیا ہے ، لیکن شاگردوں میں ان کے اتنا کوئی منہیں ہوا ہے ۔ میر صاحب مذکور کے طرز ادا میں انہوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی ہے ، سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی داد دی ہے ۔ چندے انہوں نے رفاقت میرزا محمد تقی خاں کی کی ، جو کہ پوتے میرزا یوسف کور کے تھے ، اس سبب سے دو اڑھائی برس بود و باش ان کی فیض آباد میں ہوئی تھی ، وگرنہ پرورش انہوں نے لکھنؤ میں پائی ہے ، اور کیفیت زندگی کی وہیں اٹھائی ہے ۔ بشۂ بارہ سو آٹھ ہجری میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے ، نواب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگالہ مرض الموت میں گرفتار تھے ، اگرچہ معالجہ میں انہوں نے رنگ مسیحائی کے دکھلائے ، لیکن قضا و قدر سے لاچار تھے ۔ بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے ، خلف الصدق سے ان کے ، یعنی نواب عضدولہ ناصر الملک سید بابر علی خاں بہادر دلیر جنگ سے ، نہایت موافقت آئی ، اور صحبت نے بشدت یکسدگی پائی ۔ چنانچہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہے ،

اور قریب لاکھ روپیہ کے بنگالہ میں پیدا کئے، لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے ہی بلائے روزگار تھے، کہ جس دن مرشدآباد سے نکلے تو قرض دار تھے۔ غرہ ذی حجہ کو سنہ ۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ ہجری میں اپنے ہی مزاج نازک سے، ناحق روزگار چھوڑ کلکتے میں چلے آئے، اور زمانے کی بے رنگی کو مطلق خیال میں نہ لائے، بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بہ عزت تمام کلکتے میں اوقات بسر کرتے ہیں، اور اک رنگ کی صحبتوں میں دن رات بسر کرتے ہیں۔ طبیعت ان کی موسیقی کی طرف لڑکپن سے ہے، اور ایک مناسبت بھی بھلی چنگی ان کو اس فن سے ہے۔ اپنی آشفتہ مزاجی میں غزلوں کو انتظام نہیں دیا ہے، وگرنہ مدت سے ایک دیوان کا سرانجام ہو چکا ہے۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں •

جی تھا آنکھوں میں یار تھا دل میں
یہاں تلک انتظار تھا دل میں

آبلہ ہو کے دم میں پھوٹ بہا
یہ کہاں کا بخار تھا دل میں

مر گئے پر بھی ہم کو خاک ندی
آج تک یہ غبار تھا دل میں

کھنچے ہی نکل اے کمان ابر
تیر مژگاں دو سار تھا دل میں

دم آخر جو ہچکی آتی تھی
وہ فراموش گار تھا دل میں

دست و لب نزع میں جو ہلتے تھے
شوق بوس و کنار تھا دل میں

دم شماری تلک بھی آشفتہ
قدموں کا شمار تھا دل میں

ولہ

فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ
ادھر ادھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ

نہ پیچ و تاب کو بالوں کے طول دو اتنا
ہمارا دل ہے پریشان، دیکھتے جاؤ

بجائے اشک نکلتے ہیں پارہائے جگر
تمہارے ہجر میں تھا ارمان، دیکھتے جاؤ

دکھانے آئے تھے دامن کے چاک کی غنچے
ہمارا چاک گریبان، دیکھتے جاؤ

کیا خرید زلیخا نے مصر میں یوسف
جناب عشق کی تم شان دیکھتے جاؤ

اگرچہ ہوویں گی تصلیح لیکن آشفتہ
کوئی گھڑی کا مہمان، دیکھتے جاؤ

وصل اس کا خدا قریب کرے — ولہ — دیکھیں، تب ہم سے کیا رقیب کرے
ہجر سے قتل، وصل سے احیاء — حسب میں جو آوے، سو حبیب کرے
گل کا دیکھا چٹک کے چپ ہونا — شور کیوں کر نہ عندلیب کرے
مرگیا ایک صنم پر آشفتہ — موت ایسی خدا نصیب کرے!

یہ خرابی تو پڑی مجھ پہ ترے جانے سے — ولہ — چند بھی ڈرنے لگے اب مرے ویرانے سے
کس طرح قید کروں، یہ تو ٹھہرتا ہی نہیں — کون بر آوے بھلا، اس دل دیوانے سے؟
میں سمجھتا ہوں کہ تم جا کے نہیں آنے کے — فائدہ کیا ہے بھلا جھوٹ قسم کھانے سے
شعلہ خو! آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے — آج تو آگ ہوا غیروں کے بھڑکانے سے
دیکھتے ہی اُسے گل میرے یہ اوسان گئے — اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے
اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو صدقے تو نہ کر — ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے، ترے قربان گئے
مجھ کو کہتا ہے صنم، تجھ کو بھی اب آگ لگے — ولہ — آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے، تجھے آگ لگے
بوسہ کے واسطے چمٹا، تو لگا کہنے مجھے — بس کہیں دور بھی ہو، مُنہ کو ترے آگ لگے

باب البا

ا- بیدل

بیدل تخلص، میرزا عبدالقادر نام، قوم چغتا، لیکن نشو و نما انہوں نے ہندوستان میں پائی ہے، جودتِ ذہنِ سلیم، اور ذکائے طبعِ مستقیم، کے باعث تصویرِ نازک خیالی کی بہت نک سک کھینچ کر باریک بینوں کو دکھائی ہے۔ بیشتر اختراعات انہوں نے زبان فارسی میں کئے ہیں، لیکن اہلِ محاورہ کے مقبول نہیں ہوئے ہیں۔ آسماں جاہ محمد اعظم شاہ کے ساتھ توسل رکھتے تھے، اور موردِ الطاف و عنایت شاہزادۂ عالم و عالمیان کے رہتے تھے۔ قوت جسمانی اور طاقت بدنی قادر قوی نے اتنی انہیں عنایت فرمائی تھی، کہ اور ان کے معاصرین کے حصہ میں کم آئی تھی

چناں چہ اک روز رکاب میں شاہزادے کی عین سواری کے دوادوش میں ایک شیر نکل آیا، اور کئی بیچاروں اجل کے ماروں کو ذائقہ مرگ کا اس نے چکھایا۔ آخر میرزائے مذکور کے ہاتھ سے بکری کی طرح مارا گیا، اور اپنی جان سے بیچارہ گیا۔ دفعتاً ایسے روی خلائق سے یہ بیزار ہوئے، کہ روزگار پا کشیدہ، اور دنیاداری سے دست بردار ہوئے۔ طریقہ فقر اور گوشہ نشینی کا اختیار کیا، دل کو فراغ یاس اور خونِ تمنا سے رشکِ گلزار کیا، لیکن دروازہ ان کا کثرت اعتقاد سے مسجودِ خاص و عام تھا، اور بوسہ گاہ امیرانِ عظام تھا۔ نواب نظام الملک صوبہ دار دکھن کا خط مکرر اور متواتر اس مرکزِ دائرہ قناعت کی تحریک میں آیا، لیکن قطب آسمانِ توکل نے حرکت کو قبول نہ فرمایا۔ ایک بیتِ فارسی نظام الملک کے جواب خط میں لکھی ہے، اس سے قناعت اور جواں مردی اس شیر بیشۂ استغنا کی معلوم ہوتی ہے ✦

اس بیت کو بہ سبب زبان فارسی کے حاشیہ[۵] پر لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا اس طرح داخل کتاب کیا ہے ✦

کسے عوض دنیا کے سرکوں، جا کے چھوڑوں شادن کو   باندھی ہے مہندی قناعت کی میں اپنے پانو کو

کلیات ان کا از روئے نظم و نثر کے قریب لاکھ بیت کے مشہور ہے، لیکن اہل دنیا کی تعریف کہیں ایک مصرع میں نہیں مذکور ہے۔ بحر متدارک اور کامل وغیرہ پانچوں وزن، جن کے ناظم مخصوص شعرائے عرب ہیں، اور عجم ان سے احتیاط کرتے سب کے سب ہیں، اکثر میرزا نے غزل ان اوزان میں کہی ہے، اور داد نازک خیالی کی دی ہے۔ ازبس کہ مدار دنیائے دو روزہ کا فنا پر ہے، ۱۱۳۳ھ گیارہ سو تینتیس ہجری میں بلدہ شاہ جہان آباد کے اندر اس سرائے فانی سے عالم باقی کی طرف توجہ فرمائی۔ ان دو بیتوں نے، زبان ریختہ میں اس قادرِ سخن کے نام سے شہرت ہے پائی ✦

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے، ہم ہیں	اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے، ہم ہیں

[۵] دنیا اگر دہند، نہ جنبم ز جائے خویش   من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا　　پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہے ہم میں

۲- بیان

بیان تخلص، احسن اللہ خاں نام، شاگردوں میں سے میرزا مظہر جان جاناں کے تھا۔ سکونت دلی میں اختیار کی۔ لیکن متوطن اکبر آباد کا تھا۔ شاگردوں میں سے میرزائے مذکور کے عاشق مزاج اور شیریں زبان تھا۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان تھا۔ یہ اشعار منتخب دیوان اس سخنور خوش بیان کے ہیں +

وہ بھی کیا دن تھا کہ ہم آغوش ہم سے یار تھا　　دل کے باہر مدعی جوں صورت دیوار تھا
اس تجاہل پر پڑا میں یہ سمجھتا ہوں کہ گور میں　　وہ کہ جن کی چشم کا میں عمر بھر بیمار تھا
دیکھ کر تابوت کو، بیمار داروں سے مرے　　پوچھنے لاگا کہ اس مردے کو کیا آزار تھا

ولہ
کوئی کسی کا بیان، آشنا نہیں دیکھا　　سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا کہیں دیکھا

ولہ
آکر جوں ہی قاصد نے لیا نام کسی کا　　اس نام کے سنتے ہی ہوا کام کسی کا
کیوں آج سماتا نہیں اپنے میں خوشی سے　　کیا تجھ کو بیاں پہنچا ہے پیغام کسی کا

ولہ
عالم کو تاج و گوہر و تخت دلوا دیا　　اے آسمان بنا تو، مجھے تو نے کیا دیا
نے دین سے اطلاع ہے، نہ دنیا کی کچھ خبر　　اس عشق نے غرض ہمیں سب کچھ بھلا دیا
ایسے ہی میرے بخت جو جاتے تھے نیند کے　　خواب عدم سے کاہے کو مجھ کو جگا دیا

ولہ
کب تلک اس کی شکایت ہو نہ لب آشنا　　لیک بیگانہ ہے مجھ سے، اور سب سے آشنا
غیر کے کہنے پہ مت بیگانہ ہو یکبارگی　　دیکھ تو اے شوخ! میں تیرا ہوں کب سے آشنا

ولہ
ہمدم نہ فکر کر، کہ مرا کام ہو چکا　　گر دل مرا یہی ہے، تو آرام ہو چکا
آتا ہے تجھ کو ننگ، مرے نام سے عبث　　اے شوخ! اب تو شہر میں بدنام ہو چکا

ولہ
اگر اک صبح دم آتا وہ اٹھ کر خواب شیریں سے　　ہمارا کیا گریباں، تا صموں کا پیرہن پھٹتا

جگایا مجھ کو کس کم بخت نے ہائے — ولہ — مری آنکھوں کے آگے وہ ابھی تھا

تو تو ساقی جام ترسا کر پلاتا تھا مجھے — ولہ — یار کی آنکھوں نے مجھ کو کر دیا یکبار مست

رو کر اس سے میں کہا، مرتا ہے یہ بیمار آج — ولہ — مسکرا کر وہ لگا کہنے، کہ اس کا کیا علاج

یہ آرزو ہے کہ وہ نامہ بر سے لے کاغذ — ولہ — بلا سے پھاڑ کے پھر ہاتھ میں ملے کاغذ

وہ کون دن ہے کہ غیروں کو خط نہیں لکھتا — قلم کے بن کو لگے آگ ! اور جلے کاغذ

عرش تک جاتی تھی، اب لب تک بھی جا سکتی نہیں — ولہ — رحم آتا ہے بیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر

اک بار فوج عشق پڑے مجھ پہ ٹوٹ کر۔ — ولہ — لے کے قرار و دین و دل و ہوش لوٹ کر

لینا اگر ہے دل کو، تو لے بھی اسے کہیں — سینہ میں اب تلک تو رکھا مارکوٹ کر

ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی . کہ مثل خار — پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

کیا ایسے سے درد دل کو کہئے — ولہ — ایدھر تو سنا اُدھر فراموش

میں بس کہ خاک میں ترے کوچے کی مل گیا — ولہ — تس پر بھی تیرے دل میں ہے مجھ سے غبار حیف

تمنا بادشاہی کی کسی سفلہ کو ہووے گی — ولہ — مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو، تو کافر ہوں

کافر ہو، جس کے دل میں کچھ اور آرزو ہو — ولہ — اک مختصر سی جا ہو، میں ہوں، اور تو ہو

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی — ولہ — جس طرح کٹا روز، گذر جائے گی شب بھی

آخر تو شکایت سے مجھے منع کرے ہے — سی دیکھو ٹک ہاتھ سے اپنے مرے لب بھی

جہاں روؤں تمنا میں تری اے شمع رو پیارے — اوگے اس گل زمیں سے حشر تک جوں لالہ انگارے

قمار عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے — ولہ — اُسے کہتے ہیں عاشق جو کوئی یہاں نقد جاں ہارے

آنسوؤں تک پونچھنے کی غیر کے تدبیر ہے — ولہ — مجھ سے اتنا بھی نہیں کہتا، کہ کیوں دلگیر ہے

چرخ کی برہم زنی سے یہ تعجب ہے بیاں — لیلیٰ و مجنوں کی یک جا اب تلک تصویر ہے

شب فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے — ولہ — یہی ہے صبح سے دھڑکا، کہ رات آتی ہے

جا کہو کوئے یار میں کوئی — ولہ — مر گیا انتظار میں کوئی

وہ بھی کیا رات تھی کہ سوتا تھا / سر رکھے اس کنار میں کوئی

ولہ

جادو تھا، کہ سحر تھی، بلا تھی، / ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی

کیدھر ہے، کہاں ہے، اخوشدلی تو / ہم سے کبھو تو آشنا تھی

ولہ

رسوا ابھی سے کرتی ہوائی چشم تر مجھے / آتا ہے اس کی بزم میں بار دگر مجھے

آیا ہوں اس گلی سے ابھی، دم نہیں لیا / پھرنے چلا ہے یہ دل وحشی اُدھر مجھے

کنج قفس سوا مری قسمت میں جا نہ تھی / تو کیوں دیئے فلک نے میاں بال و پر مجھے

ولہ

جھگڑتے تجھ سے پیارے حجاب آتا ہے / وگرنہ بات کا تیری جواب آتا ہے

پیو شراب جوانو! کہ موسم گل ہے / ہمیں بھی یاد وہ عہد شباب آتا ہے

اپنے دل سے بھی عداوت ہو گئی ہے اب مجھے / دشمن جانی ہو میرا، جو کوئی چاہے مجھے

کوئی مجنوں قیس نہ دیوانہ ہوا لیلیٰ کا / میں ترے عہد میں دیکھوں ہوں صد مجنوں سے

ولہ

کیا زلف میں اُس شوخ کے تھی دل کی صبح / یا شام سے پھولی تھی کسی شب کی صبح

تک زلف کو میں ہاتھ لگایا، کہ ادھر / ہمسایہ پکارا، کہ ہوئی کب کی صبح

رباعی

جس وقت کہ بیدار وہ ہوتا ہیں گا / عالم کی غضب سے جان کھوتا ہیں گا

غنچوں کو صبا کہیو، کہ آہستہ کھلیں / زانو پہ مرے وہ شوخ سوتا ہیں گا

رباعی

مت کہیو بیاں جام اجل پیتا ہے / یا اُس کے لئے کوئی کفن سیتا ہے

یارو جو مرے حال کو پوچھے وہ شوخ / اتنا کہیو، کہ اب تلک جیتا ہے

رباعی

سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہے مجھے / ہر چیز میں یک جلوہ دکھاتا ہے مجھے

کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہے یارب! / ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہے مجھے

رباعی

کہتا ہوں جناب حق میں ڈرتے ڈرتے / مدت گذری دعا ہی کرتے کرتے

ہے اُس کو یہ قدرت کہ بیاں سا محرم / منہ یار کا دیکھ لیوے، مرتے مرتے

۳ - بقا

بقا تخلص، محمد بقا نام، بیٹا حافظ لطف اللہ کا، شاگردوں میں سے میرزا فاخر مکین تخلص کے تھا فی الحقیقت عزیز نکتہ سنج، و باریک بیں، و معنی بند، و سخن آفرین تھا میرزا رفیع سودا تخلص کے منہ اکثر چڑھا، اور اس نہنگ بحر معانی کے ہجو میں کچھ کچھ واہیات مکر بکا، لیکن میرزا مرحوم نے مطلق اعتنا نہ کی، اور یہ بات کہی کہ میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے، سو تیری ہجو نہ کروں گا، کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے غرض اس عزیز سے زمانے نے موافقت کبھی نہ کی، اور صورت روزگار کی بیچارے نے آئینے میں خیال کے بھی نہ دیکھی۔ افلاس سے تنگ آ کر کسی کے کہے سے کچھ اعمال تسخیر کواکب کے شروع کئے تھے۔ خیال میں اس سودائے خام کے مجنون ہوئے، اور جیتک جئے سودائی رہے سنہ ۱۲۰۶ بارہ سو چھ ہجری تھی، کہ حالت میں سودائی کے یہ بات سوجھی، کہ تحصیل دولت حقیقی کی کیجئے، اور خاک راہ سے کربلاء معلا اور نجف اشرف کے دیدۂ دل میں سرمۂ حق نما دیجئے یہ عزم کر کے جہاز پر سوار ہوئے، اور منزل مقصود کی طرف قدم گذار ہوئے۔ اثنائے راہ میں اس دار فنا سے، موافق نام اپنے کے، سفر ملک بقا کا کیا۔ خوشا یہ حال کہ انجام تو بخیر ہوا +

یہ چند شعر اس راہ رو جادۂ بقا کے گوشۂ خاطر میں تھے، سو لکھے جاتے ہیں +

یاد میں تڑپے ہے دل اس ابروے خمدار کی		آج کچھ ناخن بدل ہے آہ! اس بیمار کی
دیکھئے ہیں منصب مجنوں پہ یہ لیلی صفتاں	ولہ	خاک میں ہم کو ملا، کس کو سرفراز کریں
کیا خط لکھوں اس کو حرکت ہاتھ سے گم ہے	ولہ	خامہ مرے اب ہاتھ میں انگشت ششم ہے
کس نے چمن میں رنجہ کیا عندلیب کو	ولہ	غنچے رہے ہیں دانتوں میں داب اپنی جیب کو
اس لب سے کچھ نہ چاہیے قدح، اور قدح سے ہم	ولہ	تو کیوں ملے سبو سے قدح، اور قدح سے ہم
پاتے ہیں میکدے میں بقا روز فیض سے		خم سے سبو، سبو سے قدح، اور قدح سے ہم

۴- بیدار

بیدار تخلص میر محمدی نام، شاہجہان آبادی، دوستوں میں سے خواجہ میر درد تخلص کے تھے۔ نزاکت سے معنی کے بخوبی آشنا، اور زباندان دلّی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کلام اپنا انہوں نے اصلاح کی تقریب سے خواجہ میر درد کو دکھایا ہے۔ اور اُس نقادِ بازارِ معانی سے فایدہ بہت سا اُٹھایا ہے۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب اُن کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں۔

تو نے جو مدتوں میں اِدھر کو گذر کیا　　نالے نے آج کچھ تو ہمارے اثر کیا
غیرت نہ آوے تجھ کو ستمگر ہزار حیف　　جس دل میں تو مقیم تھا واں غم نے گھر کیا
ہم غافلوں کی آہ نہ اودھر نظر گئی　　اُس نے ہزار اپنے تئیں جلوہ گر کیا
اس کھیل سے کہ اپنی مژہ کو کہ بار ہٹے　　عالم کو نیزہ بازی سے زیر و زبر کیا
دیوانے کو پری سے پہراب کر دیا دھا　　اے آنکھوں کیا کیا مرے جی کا ضرر کیا
کیدھر ہے تو کہاں ہے اجابت کہ بارہا　　میں نے بلند دست دعا عمر بھر کیا
بیدار ایسے رونے سے امان بارہا　　داماں و آستیں کو تو لوہو سے تر کیا

ولہ

آنکھوں میں چھا رہا ہے ازبسکہ نور تیرا　　ہر گل میں دیکھتا ہوں رنگِ ظہور تیرا
بیدار وہ تو ہر دم سو سو کرے ہے جلوے　　اُس کو جو تو نہ دیکھے ہیگا قصور تیرا

ولہ

جب کہا میں نے کہ اے سروِ ریاضِ خوبی　　کس کا تو آفتِ جاں ہے تو کہا تجھ کو کیا
کہنے لگا دل گم گشتہ ہے تیرا مجھ پاس　　جب کہا میں نے کہاں ہے تو کہا تجھ کو کیا

ولہ

یہ کون ہے شکار نکلا　　ہر دل ہوا امیدوار نکلا
جینے کی نہیں ہے اس مجھ کو　　تیر اس کا جگر کے پار نکلا
ہم خاک بھی ہو گئے پر ابتک　　دل سے نہ ترے غبار نکلا

جب بام پہ بے نقاب ہوکر		وہ صبح کو ایک بار نکلا
اُس روز مقابل اُس کے خورشید		نکلا بھی تو شرمسار نکلا
نالہ ہر چند ہم نے کر دیکھا	ولہ	آہ اب تک نہ کچھ اثر دیکھا
آج کیا جی میں آگیا تیرے		مُتبسّم ہو جو ادھر دیکھا
بہے بیدار کی آنکھوں سے ساقی اشک سرخ ایسے	ولہ	مے گلگوں کا کوچہ میں گویا تیرے سبو ٹوٹا
سبزۂ خط ترے عارض پہ نمودار ہوا	ولہ	حیف اس آئینۂ صاف پہ زنگار ہوا
آج آتا ہے نظر دن مری آنکھوں میں سیاہ		رات اس زلف میں دل کہ گرفتار ہوا
کھینچ کر زلف کی تصویر کہ خط میں بھیجا	ولہ	تا کہ معلوم کرے حال پریشان ہوا
اے شانہ کھولیو گرہ زلف سوچ کر	ولہ	دل سیکڑوں ہیں اس میں گرفتار دیکھنا
ہم چشم ابر دیدۂ تر گرچہ ہو سکا۔	ولہ	لیکن غبارِ غم مرے دل سے نہ دھو سکا
جو اب کے چھوڑے مجھے غم تری جدائی کا	ولہ	تمام عمر نہ لوں نام آشنائی کا
آگے ہے پنجۂ مرجاں مزا سے اُس کے		شہید ہو جو کوئی اس کفِ حنائی کا
مرے قدم سے ہے سرسبز بوستان جنوں		ہر ایک آبلہ گل ہے برہنہ پائی کا
کہو تو کس سے میں پوچھوں نشان خانۂ دوست	ولہ	کہ آشیانۂ عنقا ہے آستانۂ دوست
حال سُن سن کے ہنس دیا میرا	ولہ	کچھ تو آیا ہے مہربانی پر
آج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا	ولہ	سرخ نے کالی گھٹا اور سبز ہے مینا کا رنگ
اس سے دوچار ہو گئے جس دم	ولہ	سو جی سے نثار ہو گئے ہم
فتراک میں باندھ خواہ مت باندھ		اب تیرے شکار ہو گئے ہم
آ تیری گلی میں مر گئے ہم	ولہ	جی تھا سو نثار ہو گئے ہم
خاکِ عاشق ہے جو ہوتی ہے نثارِ دامن	ولہ	اے مری جان تو مت جھاڑ غبارِ دامن
خلشِ خارِ رہِ عشق سے اب اے ناصح		نہ رہا ایک بھی ثابت مرا تارِ دامن

ہم ترے اس دلِ نازک سے خطر کرتے ہیں	ولہ	ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
شب ہجراں میں نہ پوچھو کہ میں کیا کرتا ہوں	ولہ	صبح تک شمع کی مانند جلا کرتا ہوں
صورت اس کی سما گئی دل میں	ولہ	آہ کیا آن بھا گئی دل میں
ہم کو کہتے ہیں کہ عاشق کا فغاں سنتے ہیں	ولہ	یہ تو کہتے ہیں کہ باتیں ہیں کہاں سنتے ہیں
اُٹھ گیا ہم سے گو مکدر ہو	ولہ	خوش رہے وہ جہاں ہو جیدھر ہو
اس سے بیدار بات تو معلوم		دیکھنا بھی کہیں میسر ہو
تعجب ہے کیا ناتوانی سے میری	ولہ	کہ فصاد شرمندۂ نیشتر ہو
دل کو کرتا ہے نگاہوں میں شکار	ولہ	واہ واہ رے تری صیادی کو
دیکھ آ کر مری آنکھوں کی بہار		کر دیا باغ ہر اک وادی کو
تری مجلس میں اگر ہو گذر پروانہ	ولہ	نہ پڑے شمع پہ ہرگز نظر پروانہ
ہے زمانہ سے جدا روز و شبِ سوختگاں		شام کہتے ہیں جسے ہے سحر پروانہ
بوسۂ شمع کو جلنے کے بہانے آیا		دیکھو اے بزم نشیناں ہنر پروانہ
قید سے شمع کی ممکن نہیں چھوٹے بیدار		رشتۂ شمع سے باندھا ہے پر پروانہ
دیکھ تجھ کاکلِ مشکیں کی ادائیں شانہ	ولہ	دونوں ہاتھوں سیتی لیتا ہے بلائیں شانہ
اس کے بھر آئے ترے مرہمِ کاکل سے زخم		ہاتھ اٹھا کیوں نہ کرے تجھ کو دعائیں شانہ
ایک دن گر نہ ملی تجھ سے تو آشفتہ ہو		دیکھ لے کاکلِ مشکیں کی وفائیں شانہ
تھم گیا اشک شبِ ہجر میں روتے روتے	ولہ	سحرِ وصل کو مدت ہوئی ہوتے ہوتے
مردمِ چشم سے پوچھ اے مہ تاباں تجھ بن		کون سی شب کہ نہ گذری مجھے روتے روتے
کیوں کہ عاشق سے بھلا کوچۂ جاناں چھوٹے	ولہ	بلبلِ زار سے کیوں کر کہ گلستاں چھوٹے
کس کے آگے میں کروں چاک گریباں کہہ تو		جو ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے
عاشق کا اگر دیدۂ خوں بار نہ ہووے	ولہ	تو رشکِ چمن کوچۂ دلدار نہ ہووے

معنے سے ترے تمام خانہ ہے خراب
حیراں ہوں میں اس میں ہی گھر پایا

۵۔ بسمل

بسمل تخلص، سید جبار علی نام، متوطن جبار کمڑکی۔ چند مدت انہوں نے عظیم آباد میں گذر کئے ہیں، علاوہ تھوڑے سے دن مہاراجہ جیت سنگھ، بنارس کے راجہ، کی وکالت میں اوقات بسر کی ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ گیارہ سو چھیانوے ہجری میں میر مذکور سے بلدۂ محمد آباد بنارس میں مکرر اتفاق ملاقات کا ہوا ہے۔ جوان سلیم الطبع اور سخن فہم نظر پڑا آزاد وضع اور وارستہ مزاج دکھائی دیا۔ یہ اشعار اس کے خلاصۂ افکار ہیں ؛

نامۂ درد و الم میں نے جب آغاز کیا
جو ترے غم کے سوا تھا قلم انداز کیا

ولہ

اتنا ہی داغ عشق سے معمور ہوگیا
سینہ تمام خانۂ زنبور ہوگیا

ولہ

یار تیری ہی زلف میں دیکھا
ایک زنجیر لاکھ دیوانہ

ولہ

کیا خیال آوے بلاؤں سے اُسے پرہیز کا
ہے جو بیمار اس تری چشم بلا انگیز کا
آگ ہر ساعت برستی ہے نہ تنہا چشم سے
ہے تماشا استخوانوں میں مری گلریز کا

ولہ

جب غمزۂ چشم یار دیکھا
سو تیر جگر کے پار دیکھا
یاد آگئی مُشتِ خاک اپنی
اُڑتے جو کہیں غبار دیکھا

ولہ

دل خس و خاشاک کی صورت اٹکتا ہی رہا
گو سدا دامن کو اپنے وہ جھٹکتا ہی رہا
جستجو میں یار کی گم کردہ راہوں کی طرح
میں کبھی ادھر کبھی ادھر بھٹکتا ہی رہا

ولہ

خط ترا نامِ خدا خط ہے ادا و ناز کا
دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے اس آغاز کا

ولہ

کیا اس کو جتا دیں ہم جو ہم نے کیا ہوگا
کیا کیا نہ کیا ہوگا جب دل کو دیا ہوگا

ولہ

دل میں بہ رنگِ موج تمہارے وصال کا
بڑھ بڑھ کے اشتیاق کئی بار گھٹ گیا

ولہ

ہر دم مجھے نیاز اُسے ناز ہی رہا
انجامِ کار عشق کا آغاز ہی رہا

صیاد فائدہ ہے رہائی سے کیا مجھے — اُڑنے سے جب مرا پر پرواز ہی رہا

وله سدا نکلا ہی کرتا ہے پگھل کر آتش غم سے — سرشک آنکھوں سے میری روغن بادام کی صورت

خدا ہرگز نہ دکھلاوے کسی کو مہر بسمل کے — تمہارے خنجر مژگان خون آشام کی صورت

وله تیر نگاہ بسکہ لگی چھوٹ چھوٹ کر — چھاتی مشبکہ وار ہوئی پھوٹ پھوٹ کر

یہ داغ عشق مثل نئے نئے نواز کے — نکلے ہے بند بند سے اب پھوٹ پھوٹ کر

وله پہلو میں رکھوں میں دل ناشاد کہاں تک — اے درد کروں نالہ و فریاد کہاں تک

در آج قفس کا ہے کھلا کیجیے پرواز — اے ہم قفساں خاطر صیاد کہاں تک

وله نالے نہ سے نالے ہیں جگر افگار رکھتا ہوں — کہ لوگ ابرو جسے کہتے ہیں میں تلوار رکھتا ہوں

وله جز یاد حق نہ ہو ترے دل میں کبھو گرہ — دے سبحہ وار منہ پہ اگر اپنے تو گرہ

ہردم نمود قبضۂ شمشیر کی طرح — رہتی ہے ابروؤں میں ترے تند خوگو

وله دل کی طلب ہے اور تمنا ہے جان کی — کیا مہربانیاں ہیں مرے مہربان کی

درد و الم سے منزلت دل ہے بس بلند — یعنی مکیں سے ہے گی بزرگی مکان کی

وله لے خانہ اس غلام ارشاد کیجیے — گو کام کا نہ ہووے تو آزاد کیجیے

کوے بتاں تلک تو رسائی محال ہے — جب تک یہ مشت خاک نہ برباد کیجیے

وله پیارے یہ وضع چشم مروت سے دور ہے — دل لے کے اس طرح بھی نہ آنکھیں چرائیے

وله روبرو تیرے ہی گر ظالم نہ یہ دل کیجیے — پھر اس آئینہ کو جا کس کے مقابل کیجیے

وله اُٹھتا ہے وہ غبار ہمارے مزار سے — ٹکر لیا کرے ہے جو نت کوہسار سے

آوارگی سے باز رکھوں آہ کس طرح — دل تو گزر چکا ہے مرے اختیار سے

ط گریہ افزا اس قدر اعضا مرے سارے ہوئے — ہر بن مو جوش سے آنسو کے فوارے ہوئے

وله پیش آئی ہمارے وہ جو کچھ کہ تھی پیش آنی — اب یہ در دولت ہے اور اپنی یہ پیشانی

وله عشق کی بازی میں بسمل دل چلے دلدار سے — کس لئے تو اس قدر بیٹھا ہو جی ہار کے

تیری ہی یاد و ذکر ہی تیرا ہر آن ہے	ولہ	گویا کہ اس لئے مرے منہ میں زبان ہے	
عہد و پیمان بتاں بسکہ بے سالوسی ہے	ولہ	ایک امید تو سو باعث مایوسی ہے	
داغ اتنے ہی دیئے عشق نے تیرے کہ تمام		مو بہ مو تن پہ مرے جلوۂ طاؤسی ہے	
آیئے جلد کہ یہ بسمل مجروح ہنوز		ہر لب زخم سے مشتاق قدم بوسی ہے	
دکھ درد کو کب تلک حکایت کیجے	رباعی	دوراں کی کہاں تلک شکایت کیجے	
اس کشور دل پہ فوج غم کا ہے ہجوم		یا شاہ نجف میری حمایت کیجے	

بابُ التّاء

۱۔ تاناشاہ

نام نامی اور اسم گرامی اس بادشاہ عشرت دوست کا ابوالحسن تاناشاہ ہے۔ سلاطین نامدار اور خواقین عالی مقدار دکھن سے تھا۔ اگرچہ شہرہ عیش و نشاط کا اور آوازہ مسرت و انبساط کا اس عیش مجسم کے ماہ سے ماہی تک مشہور ہے، لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اس سرآرائے بارگاہ عیش و کامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہے۔ جس ایام میں کہ عالمگیر خلد مکان نے عادل شاہی اور نظام شاہیوں کو زیر و زبر کیا، اور صوبہ دکھن کو بعد بہت سی خرابی کے لیا، تو ابوالحسن تاناشاہ بھی نظربندی میں آئے، اور فلک نیرنگ باز نے بدلے اس عیش و عشرت کے اور ہی رنگ دکھا سامان عیش سب برہم ہوا، اور مجمع اسباب نشاط حلقۂ ماتم ہوا۔ خلد مکان نے جس قدر تنگی ان کے اوقات میں چاہی، انہوں نے قبول کیا، لیکن حقّہ کے مقدمہ میں بہت سماجت کے ساتھ اتنی بات کہلا بھیجی کہ اس کا شوق مجھے نہایت ہے، جو رعایت کہ اس کے سامان میں ہوگی وہ عین عنایت ہے۔ ازبسکہ یہ بادشاہ عشرت دوست آٹھ پہر نشۂ عیش میں مخمور رہتا تھا، حقّہ ایک دم منہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور یہ بھی معمول تھا کہ بعد ہر چلم کے ایک شیشے سے گلاب کے حقّہ تازہ

ہووے، پھر ایک شیشہ میں بید مشک کے حقہ بردار نیچے کو بھگوئے، شغل میں عیش و نشاط کے ازبسکہ دن کو کم سوتے تھے، سیکڑوں شیشہ گلاب خاص اور عرق بید مشک کے دن رات میں خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصل خلد مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے اس کی سے کہلا بھیجا۔ بارہ سولہ شیشہ گلاب کے اور آٹھ شیشہ بید مشک کے ملک فرمائے۔ سبحان اللہ! یا تو حقہ آٹھ پہر منہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور اُن کے دودِ مُغل کے رشک سے دھواں حسد کا حقہ سر آسمان میں گھٹتا تھا، یا پیچ سے فلک حقہ باز کی آٹھ چلمیں دن رات میں یہ پیتے تھے، اور گھونٹ گھونٹ کر عجب پیچ و تاب کے ساتھ جیتے تھے۔ اس میں بعد کئی دن کے حضرت خلد مکان نے فرمایا کہ سولہ شیشہ گلاب اور بید مشک کے ہر روز حقہ کے مصرف میں آنے اسراف ہے، اور امورات شرعی میں پاسِ خاطر بیجا بیجا، اور تکلف رسمی معاف ہے۔ آٹھ شیشہ ہر روز یہاں سے جایا کریں ایک شیشے سے بعد ہر چلم کے حقہ تازہ کر کے آٹھ چلمیں دن رات میں پئیں۔" جب حضور سے ہر روز آٹھ شیشہ آنے لگے، تو یہ دن رات میں لاچار چار چلموں سے دل بہلانے لگے۔ یہ ماجرا سُن کر خلد مکان نے ضد کے مارے چار شیشوں کی اور تخفیف کی۔ انہوں نے اپنے حقہ بردار کو دو چلموں کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو شیشے اور کم ہوئے، تو ایک چلم دن رات میں یہ پیا کرتے تھے۔ جس دن ان دونوں شیشوں کا بھی آنا موقوف ہوا، اُس دن انہوں نے عرض کیا۔ جہاں پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس چلمیں روز اسی خرچ کے ساتھ سالہا سال پلا سکتا ہے، اُمید ہے کہ بھیڑی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہووے کہ نہال نمک حلال کا زمین میں سرخروئی کے بووے۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت اعلیٰ کو امورات شرعی کا بہ شدت دھیان ہے، اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گر اٹھا کر، نہایت آسان ہے، تو جو ہمارے مصرف بیجا کا کفیل ہوتا ہے ابھی ایک دم میں جمع پونجی سرپلتہ دمڑ کے رو دیتا ہے۔ غرض اُس دن سے پھر حقہ نہ پیا، جب تک کہ ان کی نظر بندی میں رہے، اور اس سرائے فانی سے عالم باقی کو تشریف لے گئے۔ سبحان اللہ! بچشم حقیقت بین سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جائے حسرت ہے، بلکہ خانۂ زحمت۔

کدھر ہیں خسرو جم لطف کیقباد کدھر — کہاں سکندر و دارا کہاں ہے کیکاؤس
جو مست جاہ ہیں دیکھیں وہ چشم عبرت سے — کچھ ان کے ساتھ گیا غیر حسرت و افسوس

اگرچہ ملک گیری اور کشورستانی کے معاملہ کو سمجھنا شاہانِ عالی تبار پر ختم ہوا ہے، گدائے گوشہ نشین کو دخل ان امورات میں کیا ہے، لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکان نے استیصال بادشاہانِ دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد[1] کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے، تحصیل حاصل سے بھی اس میں کچھ کیفیت زیادہ ہے، کس واسطے کہ پیش از تسخیر دکن کے بھی خراج و باج اس طرف سے چلا آتا تھا، اور بادشاہان ہندوستان کا شہنشاہ کہلاتا تھا۔ مآل اس مشقت کا اعجوبہ نظر آیا، کہ اس حسن تردد نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھایا۔

واقف رموزِ ملک سے ہیں شاہ و شہریار — ہے تو گدائے گوشہ نشیں لطف کچھ نہ بول[2]

غرض شاہ عالیجاہ ابوالحسن تاناشاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں، اور باعتبار محاورۂ دکن کے، اور بندش قدیم کے، کہ اس مطلع میں ہے، ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی گوشِ دل کو دھرتے ہیں۔ مطلع یہ ہے:

کس سوں سکھوں، جاؤں کہاں، مجھ دل تو کھیل بھیا ہے — اک بات کے ہونگے سجن، یہاں جی ہی ہارہ بات ہے

۲۔ تاباں

تاباں تخلص، میر عبدالحی نام، شاہجہان آبادی۔ نہایت عزیز خوبصورت اور صاحب جمال تھا، ایسا کہ دلی سے شہر میں بے مثال تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھوں سے دین و دل نذر کرتے تھے، اور پرے کے پرے عاشقانِ جانباز کے یاد میں اس لبِ جان بخش

---

[1] مکہ مسجد حیدرآباد میں اب تک موجود ہے۔ اس کا کھدوانا خلاف واقعہ ہے ۱۲

[2] مصنف نے حافظ کے اس شعر کا ترجمہ کیا ہے ع

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند — گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

مسیحا دم کے مرتے تھے۔ تکلف یہ ہے کہ اس رعنائی اور دل ربائی پر خود بدولت بھی دل کو کھو بیٹھے تھے، اور ہنستے ہنستے بے اختیار صبر اور اختیار کو رو بیٹھے تھے۔ اس بے دردی اور شیریں ادائی پر مانند فرہاد کے چاشنیٔ درد سے آگاہ، اس سرد مہری اور لیلیٰ صفتی پر مانند مجنوں کے ہمیشہ سرگرم نالہ و آہ تھے، یعنی ایک سلیمان نام لڑکے کو چاہتے تھے، اور اُس کے دردِ محبت سے، باوجود وصل کے، آٹھ پہر کراہتے تھے۔ وہی سلیمان، کہ بالفعل شاہ سلیمان کر کے معروف تھا، اور اداکرنے میں راہ و رسم درویشی کے بہ شدت مصروف، اس مردِ ضعیف نے عالمِ پیری اُس کا ہاں ۱۲ سنہ بارہ سو ایک ہجری سے، کہ بلدۂ لکھنؤ میں دیکھا۔ اگرچہ ریش سفید اور قد خمیدہ رکھتا تھا، لیکن اُسکے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کسی وقت میں بڑے بڑے گردن کش، سوئی کے ناکے سے نکالے ہوں گے ✦

غرض میر عبدالحی تاباںؔ تخلص میرزا جان جاناں مظہر سے اور میرزا رفیع سوداؔ سے ہمیشہ صحبت رکھتے تھے، بلکہ میرزا رفیع سوداؔ بنا بر اک نظر توجہ کے، کہ اُن کے حال پر تھی، اکثر اشعار کو اُن کے اصلاح کرتے تھے۔ عین شباب کے عالم اور جوبن کے عروج میں، کہ زمان فرمان فرمائے محمد شاہ فردوس آرام گاہ کا تھا، اس ماہِ تابانِ حسن نے جامۂ زندگی کو مانند کتان کے چاک کیا ہے

یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے ✦

سر سبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا
آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا

اکثر جو اس زمین کو ہوتا ہے زلزلہ
شاید گڑا ہے جسم کسی بے قرار کا

کس کس طرح سے دل میں گنتی ہیں حسرتیں
ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

ولہ
انگر کو چھپا رکھیں، میں دیکھ کے سمجھا
تاباں تو تہِ خاک بھی جلتا ہی رہیگا

ولہ
کوئی دوست مجھ سا تاباں نہ ہوگا
کہ دل دے تجھے پھر پشیماں نہ ہوگا

ولہ
جفا سے اپنی پشیمان نہ ہو، ہوا سو ہوا
تری بلا سے، مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم
وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

ولہ بیتابیوں کی عشق کے کرتا ہے کیا علاج ۔ تاباں یہی جو دل ہے تو آرام ہو چکا

ولہ آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا ۔ جس کو دیکھا سو اپنے مطلب کا
ہیں بہت جامہ زیب، پر ہم نے ۔ کوئی دیکھا نہیں یہ چھب ڈھب کا
یاں پلک بھی نہ ہم سکیں جھپکا ۔ ایسا قاصد تو جائیو لپکا

ولہ دیا ہے جی میں اپنا دیکھ کر سج جسکے جامے کی ۔ اُسی کالے کے دامن کیجیو یارو کفن میرا

ولہ لیا تھا دوستی سے جن نے دل ہائے ۔ وہ اب دشمن ہوا ہے میرے جی کا
مجھے ترسا کے اس کافر نے مارا ۔ نتیجہ کیا یہی تھا عاشقی کا

ولہ ہونٹوں پہ تیرے ظالم مسّی کی یہ دھڑی ہے ۔ یا اُن کے تئیں کسی نے لِل کیا ہے نیلا

ولہ اکیلا صنم باغ میں کل گیا تھا ۔ اسے دیکھ کانٹوں پہ گُل لوٹتا تھا

ولہ لیا چاہ سے کھینچ یوسف کو اپنے ۔ ترا عشق تاباں قیامت رسا تھا
فغاں نے مرا مُنہ پھر آکر کھلایا[۱] ۔ ابھی روتے روتے ہی چپکا رہا تھا

ولہ مری لوح تربت پہ یارو کھدانا ۔ نہ اس سنگ دل سے کوئی جی لگانا
ترے غم سے نسیاں ہے یاں تک تو مجھکو ۔ اِدھر بات کہنا اُدھر بھول جانا

ولہ گلی میں اپنی روتا دیکھ مجھ کو وہ لگا کہنے ۔ کہ کچھ حاصل نہیں ہونیکا ساری عمر رو بیٹھا

ولہ صبا میرا پیغام اُن تک تو لے جا ۔ کہ تجھ بن رہیں ہم، کہاں یہ کلیجا!
کسی بات کا میں نہ شکوہ کروں گا ۔ ترے جی میں آوے سو مجھ کو کہے جا

ولہ ایسے کے تئیں کوئی سر پہ بھی چڑھاتا ہے؟ ۔ کھینچے ہے تری زلفیں، کیا شوخ ہے یہ شانہ

ولہ تمہارے ہجر میں رہتا ہے غم ہم کو میاں صاحب ۔ خدا جانے جئیں گے یا مریں گے ہم میاں صاحب

ولہ مرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن ۔ لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہے کیا قدرت

[۱] یعنی کھلوایا ۱۲

غیر کے ہاتھ میں اُس شوخ کا دامان ہے آج	وله	میں ہوں اور ہاتھ ہی اور میرا گریبان ہو آج
لے میری خبر چشم سے یار کی کیوں کر	وله	بیمار عیادت کرے بیمار کی کیوں کر
کہتے ہیں اثر ہیگا گریہ میں یہیں یہ باتیں	وله	اک دن بھی نہ یار آیا روتے ہی کٹیں راتیں
سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں	وله	کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں
بیمار ہے زمیں سے اُٹھتی نہیں عصا بن		نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں
قسمت میں کیا ہی دیکھیں جیتے رہیں کہ مرجائیں		قاتل سے اب تو ہم نے آنکھیں لڑائیاں ہیں
آشنا تو مجھ سے ایسا ہے کہ جیسا چاہیئے	وله	پر جو کچھ دل چاہتا ہے ہائے وہ ہوتا نہیں
شب کو پھرے وہ رشک ماہ خانہ بخانہ کو بکو	وله	دن کو پھروں میں دادخواہ خانہ بخانہ کو بہ کو
گئے نالہ ترے برباد جوں بانگ جرس چپ رہ	وله	اثر دیکھا تری فریاد میں مل ہم تے بس چپ رہ
سلیماں کیا ہوا گر تو نظر آتا نہیں مجھ کو	وله	مری آنکھوں کی پتلی میں تری تصویر پھرتی ہے
بتاں کے شہر ناپرساں میں کب کوئی داد کو پہنچے	وله	مگر یہاں اپنے بندوں کی خدا فریاد کو پہنچے
تو بھلی بات سے بھی میری خفا ہوتا ہے	وله	کیا بھلا چاہنا ایسا ہی بُرا ہوتا ہے ؎
تیری ابرو سے مرا دل نہ چھٹیگا ہرگز		گوشت ناخن سے کہوں کوئی جُدا ہوتا ہے
ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے	وله	تجھے بے مروت مروت کہاں ہے
میں شکوہ کروں جور ظالم سے لیکن		مجھے آہ و نالہ سے فرصت کہاں ہے
بیاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی		مجھے بات کہنے کی طاقت کہاں ہے
جو اُس کی کمر میں نے دیکھی ہو تاباں		رگ گل میں ایسی نزاکت کہاں ہے
جو کرتا ہوں فریاد میں اُس کے آگے	وله	تو کہتا ہے تاباں تو جاتا نہیں ہے
ابھی پست ہو جائیگا[1] نالوں کے مارے		ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے

۱؎ ہو جائیگا یعنی ہو جائے گا۔

رباعی

ہوتا ہوں ترا جو اشتیاقی ساقی
بیخود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی
ہے مجھ کو خمار شب کا لالا، صبح ہوئی
شیشے میں جو کچھ کہ رہے ہو باقی ساقی

مخمس

بیاں میں کیا کروں دیوانگی کا اپنی افسانہ
نہ میرا گھر میں جی لگتا نہیں بھاتا ہے ویرانہ
خوش آتا ہے مجھے گلیوں میں سنگِ کودکاں کھانا
ارے ناصح عبث ہے یہ ترا بیہودہ سمجھانا
پھرے ہے وہ جدا جس کا سو ہو کیونکر نہ دیوانہ

عبث مت بک نہیں میں مانتا کہنا ترا ناصح
مری آہ و فغاں کرنے سے بتلا تجھ کو کیا ناصح
میں اپنے جی ہی سے بیزار ہوں مت تُو ستا ناصح
بھلا چاہے تو اپنی آبرو کو لے کے جا ناصح
مجھے بیطرح آتا ہے تری باتوں پہ جھنجھلانا

تو کیوں بیہودہ بکتا ہے نصیحت کے سخن اکثر
سنوں کیونکر تری باتیں کہ میرا حال ہے ابتر
رہوں اُس سے بے یار اے ناصح بھلا کیونکر
کہ میری زندگی اور موت ہے موقوف اس جا پر
اگر آوے تو جی جاتا وگر جاوے تو مر جانا

کبھی اتو کے تئیں کرتا ہوں گھر میں نالہ و افغاں
کبھی پھرتا ہوں صحرا ہی میں وحشت سے ہو عریاں
کبھو ہوتا ہے تاباں ساتھ میرے محشرِ طفلاں
مرے تئیں اس طرح سے دیکھ کر سب خوب و بد ہیں گرداں
کوئی کہتا ہے سودائی کوئی کہتا ہے دیوانا

باب الجیم

۱- جہاندار

جہاندار تخلص، میرزا جواں بخت جہاندار شاہ نام، خورشید آسمانِ بلند اختری اور سرفرازی کا ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی کا، رونق دینے والا بارگاہ جہانداری اور جہانبانی کو، زینت بخشنے والا مسندِ ملک گیری اور کشورستانی کو، ہر خط جبینِ جہاں افروز کا اُس کے واسطے روشن کرنے عالم کے، مانند خطوط شعاعی آفتاب کے، دور کرنے والا تاریکی فلاکت کا تھا، اور دست دریا نوال اُسکا

افراطِ جود و کرم سے مانند یدِ بیضا کے روشن کرنے والا خوش ناموسیِ امارت اور ایالت کا بخشش نے
اُس کی، دشمنی آسمان کے دل سے فلک زدوں کی نکالی، اور ہمت نے اُس کی گرہ بدطالعی کی
پیشانی سے بدبختوں کی کھول ڈالی جس ایام میں کہ ناموافقت سے اُمراءِ دولت کی۔ نشانِ کیوان
شان اس فلک جناب کے دار الخلافہ دلّی سے بیچ حرکت کے آئے، تو ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے
ہجری تھے، کہ خود بدولت و اقبال لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب
آداب و خدمت گذاری کے تھے، سب ادا کئے، خواصی میں بیٹھنے کے سوائے گھڑیوں ہاتھ باندھے
سامنے کھڑے رہے۔ باوصف اس نازپروری کے کبھی پیادہ چار قدم کاہے کو چلے تھے۔ پانچوں
ہتیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ حجرہ گاہ سے جا کر آداب بجا
لاتے تھے۔ غرض اس شہزادۂ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی، کہ مہینے میں دو مرتبہ
بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی۔ شعرائے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے
دن بلواتے، اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرم جوشی فرماتے۔ چنانچہ
راقم حقیر کو جب یاد فرمایا، تو اس ہیچمدان نے یہ عذر کہلا بھیجا کہ "کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے
موقوف کیا ہے، ازبسکہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یارانِ عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر
ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی میں حاضر ہوں، اور اس تخم ناکاشتنی بیمغز
کو موافق ارشاد کے زمین عرض میں بوؤں۔ پذیرا نہ ہوا، پھر چوبدار آیا، اور یہ ارشاد فرمایا کہ "تیرا آنا
ہونا مشاعرے میں نہایت ضرور ہے، مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں نہیں دستور ہے۔" غرض
ایما سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا، اور شرفِ سعادتِ ملازمت کا حاصل کیا۔ مگر غزلیں
اُس دن ازراہ تفضلات کے پڑھوائیں، اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنائتیں فرمائیں۔ پھر اپنی
طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا، اور سامعین کو موردِ عنایت و امداد فرمایا۔ سنہ ۱۲۰۱ھ بارہ سو ایک
ہجری میں بلدۂ بنارس کے اندر اس سریر آرائے بارگاہ شوکت و اجلال نے تخت نشینی ملکِ فنا
کی چھوڑ کر اورنگ آرائی کشور بقا کی اختیار کی۔ یہ اشعار منتخب اُس سلطان عالی تبار کے ہیں: —

نہ پوچھو دہر میں کیا کر چلے ہم — اسی ہی آرزو میں مر چلے ہم
رہے اک شب جو اس ماتم کدے میں — بسانِ شمع رو رو کر چلے ہم
اکیلے تھے ہم اب اک فوجِ غم ہی — ترے دم سے ہم لشکر چلے ہم
نہ تھے جوں گل کبھی اوراقِ دل جمع — کہ اس گلشن میں کر ابتر چلے ہم
رہے در پر بتاں کے تم جہاندار — خدا حافظ تمہارا گھر چلے ہم

جدا ہو تجھ سے صنم سخت بیقرار ہوں میں — وله — یہ دیکھ آئینہ ساں چشم انتظار ہوں میں
بسا ہے میرا سراپا جو عطرِ فتنہ سے — یہ کس کی نرگسِ فتّان سے دوچار ہوں میں
نہ جور سے فلکِ حیلہ گر کے گھبرا کر — مثال ابرِ بہاری کے اشکبار ہوں میں
نظر پڑا ہے وہ آویزۂ گہر جب سے — صدف سے چشم کی تب سے گہر نثار ہوں میں
ہے آفتاب کا سر پہ مرے جو پرتوِ مہر — بسانِ ماہ جہاندار آشکار ہوں میں

ہیں بسکہ جزوِ تن مرے طاؤس آسا داغ — وله — رکھتا ہے ایک ایک عجب ہی بہار داغ
رعنائی تیری دیکھ کے اے سروِ باغِ حسن — جوں لالہ دل پہ کھاتے ہیں سب گلعذار داغ
آتش پہ جیسے دل کی جہاندار جوں سپند — چاہوں جو ٹھہرے، کہ نہیں سکتا قرار داغ

٢-جرأت

جرأت تخلص، یحییٰ امان قلندر بخش نام، بیٹا حافظ امان کا۔ شاعر شیریں کلام ہے۔ بظاہر الفقلان کلان کے بزرگوں کے نام پر بطور خطاب کے زبان اکبری سے چلا آتا ہے، اور جرأت مذکور رشید شاگردوں میں میرزا جعفر علی حسرت تخلص کے گنا جاتا ہے۔ علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے اور ستار کے بجانے میں نہایت دست رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے، ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظرِ احکام ہے۔ تمام عمرِ عزیز کی بیکاری میں بسر ہوئی ہے، اور بے روزگاری میں کٹی ہے۔ ابتدا میں نواب محبت خاں محبت تخلص اعانت اخراجات ضروری

کی کرتے تھے، بالفعل، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، صاحب عالم و عالمیان میرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے کچھ امداد ہوتی ہے۔ اگرچہ بصارت چشم سے یہ عزیز معذور ہے، پر ملاقاتوں کو دوستوں کی پھرتا دور دور ہے گو کہ آنکھوں سے کچھ نہیں سوجھتا ہے، لیکن مضمون رنگیں سوجھتا ہے۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان عظیم الشان۔ یہ اُس کا منتخب دیوان ہے +

چمن اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا — دن گیا رات ہوئی، رات گئی دن آیا

وله

دل بدن تحلیل تو جرأت ہوا جاتا ہے کیوں؟ — آہ! یہ بیٹھے بٹھائے تجھ کو کس کا غم لگا

وله

دل کو اے عشق سوئے زلف سیہ فام نہ بھیج — رہزنوں میں تو مسافر کو سرِ شام نہ بھیج

وله

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں کا داغ ایک — اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

وله

میرے ہونے سے تو کچھ گرمیٔ بازار نہیں — ہوں میں وہ شے کہ کوئی جس کا خریدار نہیں

دل تو اُمڈے ہے پہ حیرت سے میں کیونکر روؤں — ابرِ تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں

درد کیا جانئے کیا کیا یہ بیاں کرتا یار — دہنِ زخم کو گویا لبِ گفتار نہیں

تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی، کہ — جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں

وله

جس کے غم میں آہ ہم آرام سے واقف نہیں — کیا غضب ہے، وہ ہمارے نام سے واقف نہیں

رو کے میں پوچھا کہ مقصد جانتے ہو تم مرا — ہنس کے بولا میں کسی کے کام سے واقف نہیں

وله

کیا قتلِ دو عالم تو نے جنبش سے اک ابرو کی — اگر یہ جھوٹ ہو تو تیغ پر ہم ہاتھ دھرتے ہیں

برنگِ طائرِ تصویر ہیں ہم باغ حیرت میں — کب اپنے آشیاں سے صحن گلشن میں اترتے ہیں

وله

نالہ و آہ و فغاں بھی مرا دم بھرتے ہیں — آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

وله

اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں — تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ — چشم حسرت سے کہاں تک دم بہ دم دیکھا کریں

کہتے ہیں آپس میں ہمسایہ مری فریاد سے — مصلحت یہ ہے کہ اس کے پاس سے گھر چھوڑ دو

کیا کیا میں نے گناہ جو اپنے لوگوں سے یہ تم — کہتے ہو جا کر اُسے بستی کے باہر چھوڑ دو

آنے کی خبر ہے اُس کے لیکن	ولہ	آتا نہیں اعتبار دل کو
اُسکے آنے میں اب جو دیر ہے کچھ	ولہ	یہ بھی قسمت کا ہیر پھیر ہے گویا
جب نہ تب خوں مرا ہی پیتا ہے		غم بہت اس کا مجھ پہ شیر ہے کچھ
تھا یہ جرأت ہی اُس کی کوچہ میں		وہ جو اک خاک کا سا ڈھیر ہے کچھ
جاتے ہیں اُس کو دسی پہ جانا محال ہے	ولہ	جس جا قدم پڑے ہے اُٹھانا محال ہے
رونے میں اور آتش اُلفت بھڑک اُٹھی		اب اس لگی کا دل سے بجھانا محال ہے
کیا قہر ہے کہ بزم میں اُس شوخ کی مجھے		سب کہتے ہیں کہ تجھ کو بٹھانا محال ہے
جا بیٹھتے تھے در پہ جو اُس کے وہ دن گئے		اودھر کو اب تو آنکھ اُٹھانا محال ہے
کس کی سنوں بات میں اے دہر لیک	ولہ	دھیان تو رہتا ہے تمہارا مجھے
غم بہت دنیا میں ہے پر عشق کا غم اور ہے	ولہ	ہے اسی عالم میں لیکن اُس کا عالم اور ہے
گر کسی دھب سے کوئی مجھ کو ہنسا دیتا ہے	ولہ	غم فرقت وہیں کچھ یاد دلا دیتا ہے
شب کو ٹک خواب جو آتا ہے تو ٹک اُسکا خیال		آنکھ لگنے نہیں پاتی کہ جگا دیتا ہے
لخت دل کی مرے یہ اشک رواں میں ہے بہا		برگ گل جوں کوئی دریا میں بہا دیتا ہے
گھر سے وہ جاوے جہاں میں بھی پہنچوں ہوں		نہیں معلوم مجھے کون بتا دیتا ہے
سخت تجھ بن قلق اس دل کا ستاتا ہے مجھے	ولہ	گہ بٹھاتا ہے یہ اور گاہ اُٹھاتا ہے مجھے
دل بھڑکے ہے ٹک مصحف رُو جان دکھلا	ولہ	سرگرم ہے آتش اسے قرآن[1] دکھاوے
رہنے کی جا جہاں میں ہم خوب پا گئے	ولہ	جوں درد اہل درد کے دل میں سما گئے
ہم گلشن جہاں میں جوں آتشیں انار		اک دم کی زندگی کا تماشا دکھا گئے
جوش گل چاک قفس سے دمبدم دیکھا کئے	ولہ	سب نے یاں لوٹیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے
شب بزم یار میں ہم بیٹھے تو تھے پر اُس کی	ولہ	چتون سے تھا یہ ظاہر یہ شخص یہاں سے نکلے

[1] جب گھر میں آگ لگتی ہے تو قرآن دکھلاتے ہیں کہ اس کی برکت سے بجھ جاوے ۱۲

عزیز وصل میں بھی ہم جو رو رو کر نہ سوتے تھے	ولہ	سو اندیشہ تھا روز ہجر کا اُس دن کو روتے تھے
کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شب وصل کدھر تھی	ولہ	ٹک زلف سے جو رُخ پہ نظر کی تو سحر تھی
ترے بن بستر اندوہ پر کچھ یاد میں کر کے	ولہ	پڑا روتا ہوں پہروں یار منہ پر آستیں دھر کے

۳- جوشش

جوشش تخلص، شیخ محمد روشن نام، وطن ان کا عظیم آباد ہے، خوش لیاقتی ان کی جو کچھ کہئے اُس سے زیادہ ہے۔ طبیعت ان کی نظم ریختہ میں نہایت رسا ہے، اور معنی بیگانہ سے بشدت آشنا ہے۔ چاشنی درد کی کلام سے ان کے ظاہر، اور علم عروض سے یہ بخوبی ماہر ہیں۔ شیوہ اختیار انھوں نے میر درد کا کیا ہے، اور اس طور کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ جس ایام میں یہ تذکرہ لکھتا ہوں، تو شیخ مذکور نے اشعار اپنے مجھ کو بنارس بھجوائے، تاکہ نام اُس کا اس تذکرہ میں لکھا جائے۔ نہایت پسند آیا مجھ کو اسلوب ان کے بیان کا، چنانچہ اس طرح لکھا گیا انتخاب ان کے دیوان کا ✦

کس طرح سے اوصاف ہو خلاق جہاں کا		قدرت نہ قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا
عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت		مہتاب کو دیکھے، نہیں مقدور کتاں کا
اس گلشن ہستی سے نکل راہ عدم لے		نیرنگ نظر آوے ہے کچھ رنگ یہاں کا
عنقا کی طرح گو کہ نشاں وہ نہیں رکھتا		ملتا ہے پتا نام ہی سے اسکے نشاں کا
اس دل کو دکھاتا ہوں میں بازار محبت		خطرہ نہیں جوشش مجھے کچھ سود و زیاں کا
ہم چشم کیوں کہوں میں اسے شعلہ زار کا	ولہ	عالم ہے کچھ جدا ہی دل داغدار کا
سرکار بے خودی کا یہ مختار کار ہے		کیا اختیار ہے دل بے اختیار کا
پیتا ہے گر تو بادۂ عشرت سمجھ کے پی		جوشش بُرا ہے دردسر اسکے خمار کا
بزم میں یک شب بھی نہ آیا نہ دل گلگیر کا	ولہ	فائدہ اے شمع اشک و آہ بے تاثیر کا

ومبدم آلودہ رہنا خون سے عشاق کے ۔۔۔ جوہر ذاتی ہے یہ جوہر تری شمشیر کا

وله

دیکھ کر رنگ صنم تیری جفا کاری کا ۔۔۔ کوہکن ہو تو نہ دم مارے وفاداری کا
چشم پُر آب ہے لب خشک دماغ آشفتہ ۔۔۔ زور عالم ہے غرض دل کی گرفتاری کا
مسکراتا ہے مجھے دیکھ رقیبوں کے حضور ۔۔۔ یاد ہے اس کو عجب طور دل آزاری کا

وله

بھی سیر میں گلزار کی، تن کنج قفس میں ۔۔۔ یہ صید گرفتار ادھر کا نہ اُدھر کا

وله

گرکوئی کاٹ بھی دے سرتک دیوانے کا ۔۔۔ پر یہ سودا تو کبھو سر سے نہیں جانے کا
کیوں نہ مضطر ہوں اُسے دیکھ کے دیکھو تو سہی ۔۔۔ شمع کے سامنے کیا حال ہے پروانے کا
ہاتھ اُٹھاتا ہی نہیں یار جو سُلجھانے سے ۔۔۔ دل تری زلف میں اُلجھا ہے مگر شانے کا

وله

سر اُس کی تیغ سے جبتک جُدا نہ ہووے گا ۔۔۔ کسی طرح سے حق اس کا ادا نہ ہووے گا
کل اُن نے بیٹھ کے غیروں میں کی نگہ مجھ پر ۔۔۔ یہ تیر کس کے جگر میں لگا نہ ہووے گا
دل و جگر پہ ہی آفت نہیں فقط جوشش ۔۔۔ جو ہے یہی ترا رونا تو کیا نہ ہووے گا

وله

غیروں پہ تو ستم کرے گا ۔۔۔ ہم پر جو کبھی کرم کرے گا
ہم سا ہی وہ ہوگا سادگی میں ۔۔۔ باور جو تری قسم کرے گا
جوشش مت رو دل و جگر کو ۔۔۔ کس کا کس کا تو غم کرے گا

وله

دیکھ کر حُسن گلعذاروں کا ۔۔۔ خانہ ویران ہوا ہزاروں کا
دیکھیں گر اس کی چشم پُرفن کو ۔۔۔ ہوش اُڑ جائے ہوشیاروں کا
اُس کی آنکھوں کو دیکھیے جوشش ۔۔۔ منہ تو دیکھو شراب خواروں کا

وله

ہو چشم حباب وار دیکھا ۔۔۔ ہستی کو نہ پائدار دیکھا
جوں شیشۂ ساعت اس جہاں میں ۔۔۔ دو دل کو نہ بے غبار دیکھا
ہم مر ہی گئے پہ تو نہ آیا ۔۔۔ بس ہم نے ترا قرار دیکھا

وله

اس ادا کا تری ہوں دیوانا ۔۔۔ دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا

نستی ہے جاں بلب ترا جوشش — جی میں آوے تہے تو آ جانا

ولہ — یاں مدعی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا — ہے کوئی جسے تیرا طلبگار نہ دیکھا
سوتوں کو جگایا مرے نالے نے عدم کے — پہ طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا
کل بزم میں سب پر نگہ لطف کرم تھی — اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا
جو چشم بتاں میکدۂ دہر میں جوشش — ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

ولہ — کہتا ہے ایک عالم انصاف کر ہمارا — سنتا نہیں کسی کی بیداد گر ہمارا
اوروں کی عیب جوئی اپنا ہنر نہیں ہے — اپنی ہی عیب بینی ہے یہ ہنر ہمارا
سرگشتہ مثل مجنوں گرد باد ہیں ہم — تھک کر جہاں کہ بیٹھے وہ ہی ہے گھر ہمارا

ولہ — اپنا تو کچھ گناہ نہ آیا نظر میں — کیا بات ہو گئی کہ وہ بیزار ہو گیا

ولہ — جہاں میں بادۂ عشرت پیا پیا نہ پیا — سلوک بخت نے ہم سے کیا کیا نہ کیا
نگاہ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے — سلام اُن نے ہمارا لیا لیا نہ لیا

ولہ — جب عشق میرا شہرۂ آفاق ہو گیا — اک عالم اُسکے حسن کا مشتاق ہو گیا
کس سے ہوئی تھی دوستی ایسی کہ ان دنوں — آنا ہمارا دل پہ ترے شاق ہو گیا

ولہ — ہوا یک صدا کی طرح جس جا گذر اپنا — بجز آواز کے کوئی نہ تھا واں ہم سفر اپنا
لگا دی دل میں آگ ہی آنسوؤں کیا کیا تو نے — جلا دینا ہے اپنے ہاتھ سے بھی کوئی گھر اپنا
شب فرقت تھی بیتابی دل ہی وہ پہلو میں — نظر آتا نہیں ہم کو تو بچتا تا سحر اپنا

ولہ — تعلقات جہاں سے خبر نہیں رکھتا — ہزار شکر کہیں دردِ سر نہیں رکھتا
خفا ہوں جان سے دل کھول کر میں سعی تا ہوں — تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا

ولہ — تجھ سے ظالم کو اپنا یار کیا — ہم نے کیا جبر اختیار کیا

ولہ — اُٹھ اے طبیب جا کہ مجھے آرام ہو چکا — مرتا ہوں کوئی دم کو مرا کام ہو چکا
اب بھی کہیں اُٹھا دیگا چہرے سے زلف کو — معمور تو شکار سے یہ دام ہو چکا

لیتا تھا اُس کو دل سو لیا اُن نے نامہ بر | اب میرے کر اُسکے نامہ و پیغام ہو چکا

ولہ
تنہا یہ عشق میں نہ دلِ ناتواں جلا | مانند نخل شمع ہر اک استخواں جلا
نہ دل رہا نہ چشم رہی نہ جگر رہا | اے اشک تیرے ہاتھ سے کیا کیا نکل چلا

ولہ
وہ کیا ہوا زمانہ رونے میں جو اثر تھا | یہ چشم خوں فشاں تھی یہ دل ہی جگر تھا

ولہ
غش آگیا وہ سامنے میرے جہاں ہوا | مجھ کو وصال یار میسر کہاں ہوا

ولہ
بے طاقت اس قدر یہ دل ناتواں ہوا | حرفِ تواں بھی اُس کی زباں پر گراں ہوا
سر پر کھڑا ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں | جلاد میری جان کا یہ آسماں ہوا

ولہ
ہزار پیار کرے گا ہزار چاہے گا | مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہے گا

ولہ
کوئی اس غم کدہ میں اپنی غمخواری نہیں کرتا | دیا ہے ایک کو دل وہ بھی دلداری نہیں کرتا

ولہ
جو ترے سامنے آئے ہیں سو کم ٹھہرے ہیں | یہ ہمارا ہی کلیجا ہے کہ ہم ٹھہرے ہیں

ولہ
ایک عالم کی جاں خراش ہو یہ | آہ ہے یا قلم تراش ہے یہ
رو دیئے تا ہو سبز کشت اُمید | اب تردد ہے یہ تلاش ہے یہ
دیدۂ تر کو دوست رکھ جوشش | بہت تحفہ گلاب پاش ہے یہ

ولہ
اپنی وہ بے ثبات ہستی ہے | کہ صدا نیستی کو ہستی ہے
نام سنتے ہو جس کا ویرانہ | وہی سودائیوں کی بستی ہے

ولہ
جی میں جس وقت کہ مضمون کمر آتا ہے | بسکہ نازک ہے مجھے باندھتے ڈر آتا ہے
چشم تر آہ بہ لب خستہ جگر ہوں جوشش | بے طرح حال مرا مجھ کو نظر آتا ہے

ولہ
شبنم کی طرح سامنے اُس آفتاب کے | ہونے کو تو ہوئے تھے ولیکن نہ ہو سکے

رباعی
کچھ کام نہیں ہمیں وفا سے | تو ہاتھ نہ کھینچیو جفا سے
کل سب سے گلے ملے تم | تھے ہم بھی تو صورت آشنا سے

ولہ
چشم سے غافل نہ ہوا چاہئے | اس کے مقابل نہ ہوا چاہئے

دل کا ضرر جان کا نقصان ہے		اب کہیں مائل نہ ہوا چاہئے
فرہاد یہ بے فائدہ خارا شکنی ہے	ولہ	کم کیجئے کس دل میں یہی کوہ کنی ہی
نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی مراد شمن ہے	ولہ	ایک یہ دل ہی غرض دوست ہے یا دشمن ہے
ایک دن کا ماجرا ہی میں اُٹھا تھا سیر کو	قطعہ	دیکھتا کیا ہوں یہ جھگڑا ہی سر بازار ہے
برہمن کہتا ہی بت خانے میں ہی ذات خدا		شیخ کہتا ہی غلط کعبہ ہی میں دُنیا ہے
اس میں جوشش بول اُٹھا سنتے ہو شیخ و برہمن		جانے دو اپنی طرف دیکھو یہ کیا تکرار ہے
ممکن نہیں کہ دیکھئے روئے شگفتگی	ولہ	جبتک برنگ غنچہ گریباں نہ پھاڑیئے
جاہ و حشم کی خواہش و دولت کی آرزو ہی	ولہ	دو دن کی زندگانی تس پر یہ جستجو ہے
صورت پرست ہوں میں مانند آئینہ کے		جو کچھ ہے میرے دل میں سو میرے روبرو ہے
کہتا ہوں درد دل تو وہ کہتا ہی کیا مجھے	ولہ	چپ رہیے بس زیادہ نہ باتیں بنایئے
لاکھوں ہی کئے قتل گنہگار مجھی سے	ولہ	رہتی ہے مڑی اک تری تلوار مجھی سے
کوئی سوائے شانہ وہاں چھوٹتا نہیں	ولہ	دیکھو تو کوئے زلف میں کیا بند و بست ہے
کشورِ عشق میں رسوا سر بازار ہوئے	ولہ	اُس کے ہاتھ آپ بکے جس کے خریدار ہوئے
میں آنہ سکوں اور صبا جاکے رہی ہے	ولہ	کوچہ میں ترے یار عجب باد وہی ہے
جی چاہے تو ملئے جو نہ چاہے نہ ملئے	ولہ	دل میں تو ہمارے نہ یہی ہی نہ وہی ہے
جوشش تو یہاں تک ہوا رسوائے خلایق		جو دیکھے ہے کہتا ہے یہ دیوانہ وہی ہے
دل میں بھری ہی آگ اور آنکھوں میں آب ہے	ولہ	مانند شمع حال ہمارا خراب ہے
دیکھا ہے جب سے زلف کو شانے کے ہاتھ میں		جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ و تاب ہے
اے عشق مجھے خوار کیا کیا کیا تو نے	ولہ	رسوا سر بازار کیا کیا کیا تو نے
جس طرح دل کا داغ جلتا ہے	ولہ	اُس طرح کب چراغ جلتا ہے
اُس رخ صاف کے آگے جو کبھی آتا ہے	ولہ	آئینہ اپنا ہی مُنہ دیکھنے لگ جاتا ہے

ہوے صحرانشیں تشریف لاوے جس کا جی چاہے | ولہ | در و دربان نہیں رکھتے ہیں آوے جس کا جی چاہے
گرہ میں غنچوں نے نافے کے نافے باندھ لئے | ولہ | چمن میں کھل جو گئی زلف مشک بو تیری

مرنا تو بہتر ہے جو مر جائیے | ولہ | جی سے کسی کے نہ اُتر جائیے
سوئے حرم یا طرف بت کدہ | | الغرض اے شیخ جدھر جائیے
تت نئے عذر ہیں نہ آنے کے | ولہ | ہم دیوانے ہیں اس بہانے کے

قطرے میرے آنسو کے ہیں اک لخت شرر سے | ولہ | کیا آگ برستی ہے مرے دیدۂ تر سے
آشنا جب سے ہوئے اُس بُتِ ہرجائی سے | ولہ | دربدر خاک بسر پھرتے ہیں سودائی سے
گر جان دے کوئی پر نہ اس کے ہونگے | رباعی | جی شوق سے لیں گے اس کا جس کے ہونگے
جوشش نہ رکھ ان بتوں سے ہرگز امید | | یہ کس کے ہوئے ہیں اور کس کے ہونگے

بابُ الحاء

۱ - حاتم

حاتم تخلص، شاہ جہان آبادی مشہور ریختہ گویوں میں سے دلی کے تھا ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور مرزا رفیع سودا کا شاعر خوش بیان تھا صاحب دو دیوان تھا، ایک دیوان میں نہایت مبہم ایہام کیا ہے اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے جامع ہے طور متاخرین اور طرز ایہام کا۔

گلشن اُس گل بن مری نظروں میں ویراں ہو گیا | | جھاڑ جھاڑ اور بوٹا بوٹا دشمنِ جاں ہو گیا
ایک نے پائی نہ اب تک نبض کی رفتار حیف | | اور میرا تختۂ مشق طبیباں ہو گیا
اشک خوں آلودہ میرے اس قدر جاری ہیں آج | | جا بجا لعلوں سے ہندستاں بدخشاں ہو گیا
شور دریا تک ملاحت کا تری پہنچا ہے شور | | بے نمک آگے ترے لب کے نمک داں ہو گیا
فیض صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں | | طفل مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا
سجن نے یاد کر نامہ لکھا اور ہم ہے غافل | ولہ | بجا ہے معذرت لکھنا ہمیں کاغذ خطائی پر

ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی	ولہ	کہ کہیں سب جہاں وصال ہوا
مثالِ کمر مو میں مارتا ہے	ولہ	لیا ہے میں نے اس جگ سو کنارا
بالے پن سیں مجھے سودا ہے ترے گیسو کا	ولہ	بال باندھا ییاں بندا ہوں تم گیسو کا
مجھے درکار نہیں مشک و عبیر و صندل	ولہ	ہوں دیوانہ میں پری رو کے چونکے لو کا
زور چپکے سے مرے دل کا کبوتر حاتم بہت سے ملی		بہرت کرتا ہے جب اڑتا ہے اسی کے کو کا خیال
ہر اک سخن ہوا ہے ہمارا مثال قند	ولہ	شیریں لبوں کے جب ستی بوسے لئے ہیں ہم
ترے رخسار و قد نے دھوم ڈالا ہے گلستاں میں	ولہ	ادھر بلبل سسکتی ہے ادھر قمری بلکتی ہے
دو چار اب تجھ سے کیونکر ہوئے ہم چشمی کے دعوے	ولہ	کہ نرگس کی چمن میں دیکھ کر گردن ڈھلکتی ہے
پری ہم جان کر اس کو چھپائے شیشہ خالی میں		یہ تو بھی دخترِ رز پردۂ مینا سے تکتی ہے
جب سے تمہاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں	ولہ	تب سے جہاں میں تم نے دھومیں مچائیاں ہیں
زلفوں کا بل بتانا آنکھیں چرا کے چلنا		کیا کج ادائیاں ہیں کیا کم نگاہیاں ہیں
حاتم کے بن اشارے سچ کہہ یہ چشم و ابرو		کس سے لڑائیاں ہیں کس پر چڑھائیاں ہیں
تمہارے غنچۂ لب کے شوق میں گلشن کی سب کلیاں	ولہ	چمن میں سن خبر آنے کی استقبال کو چلیاں
لگن میں تجھ ستمگر کے عجب مجلس میں غم گذرا		شمع رو رو کے ساری رات سرتاپا گھڑی جلیاں

۲۔ حزین

حزیں تخلص، میر باقر نام، متوطن شاہجہان آباد۔ شاگردوں میں میرزا جان جاناں مظہر کے تھے۔ دلّی سے جب جدائی انہوں نے لاچار کی، تو عظیم آباد میں بود و باش اختیار کی۔ رفیق تھے نواب بافرہنگ سید احمد خاں صولت جنگ کے، زندگی بسر کی ہے انہوں نے ساتھ رعایت ناموننگ کے۔ بہت فہمیدہ اور آشنائے درست، دوستیوں میں نہایت چالاک و چست۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، خلاصہ اشعار ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں ٭

غم نے آباد کیا خانۂ ویراں میرا ‏ ‏ ابر مژگاں سے ہوا سبز بیاباں میرا

وله
یہ کہہ کے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت! ‏ ‏ لکھا تھا یوں کہ فصل گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

وله
گوارا ہو گیا دل پر جفا سے جور یار آخر ‏ ‏ ہمیں رنج و الم سے ہو گئے صحبت ہوا آخر

وله
غم نے لیا ہے گھیر مجھے یاں تلک کہ اب ‏ ‏ دیتا ہے ساتھ دینے سے مجھ کو جواب دل

وله
فصل گل آخر ہوئی، کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم ‏ ‏ کچھ کر لے صیاد، اب ہوں گے نہیں آزاد ہم
رحم آتا ہے مجھے اس مشت خاک اپنی پہ ہائے! ‏ ‏ خوبرویوں کی ہوائیں ہو چکے برباد ہم

وله
اس بے وفا کے ہاتھ سے کچھ مجھ کو حسن نہیں ‏ ‏ پاؤں تلک بھی ہائے مجھے دست رس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب ‏ ‏ چاہیں کہ جل مریں، تو کہیں خار و خس نہیں

وله
کچھ کہا شاید اُن نے قاصد سے ‏ ‏ دل پہ ہے کہ وہ اضطراب نہیں

وله
آوے نہ کیونکہ رشک مجھے برگِ پان سے ‏ ‏ لیتا ہے کیا مزہ وہ سجن کے لبان سے

وله
نہ وصل میں اُسے راحت، نہ ہجر میں آرام، ‏ ‏ کسی طرح سے حزیں دل کے تئیں قرار نہیں

وله
تو نہ ڈر اتنک اُٹھا نقاب کے تئیں ‏ ‏ میں سنبھالوں گا[1] اضطراب کے تئیں

وله
کیونکہ خاطر خواہ دل کے درد کی تقریر ہو ‏ ‏ کب یہ معنی نقط میں آتے ہیں، کیا تحریر ہو

وله
کچھ گئی ہجر میں، کچھ وصل میں گریاں گزری ‏ ‏ کیا مری عمر کی اوقات پریشاں گزری

وله
خوباں کے درد و غم نے کیا ناتواں مجھے ‏ ‏ یاں تک کہ مو بھی تن پہ ہوئے ہیں گراں مجھے
کیوں کر کروں جفا کی شکایت میں اُس ستی ‏ ‏ کرتا ہے وہ وفا میں کبھو امتحاں مجھے

وله
وفا میری اگر جور و جفا تجھ کو دکھلاتی ‏ ‏ تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی

وله
حزیں میں درد دل کا کس طرح ظاہر کروں اُس سے ‏ ‏ مجھے کہتا ہے "تیری بات مجھ کو خوش نہیں آتی"

وله
مجھے کہتا ہے "تیرا دل کہاں ہے" ‏ ‏ قیامت شوخ ہے میرا بدگماں ہے

[1] یہ لفظ تقطیع میں نہیں آسکتا۔ غالباً "سنبھالتوں" ہوگا۔

۳- حسرت

حسرت تخلص، میرزا جعفر علی نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، بیٹا میرزا ابو الخیر کا تھا۔ صاحب قصاید و دیوان ہے، اور سر حلقہ موزونان خوش بیان ہے۔ اکثر تو مشق لکھنؤ کی مع جرأت دم شاگردی کا مارتے ہیں، اور یا اُستاد کہکے پکارتے ہیں۔ نخاس کے اندر دُکان عطاری کی یہ عزیز رکھتا تھا، اور اوقات اسی وجہ حلال سے بسر کرتا تھا۔ سنہ ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری میں تخمہ بند کرکے دُکان وجود کو سیر بازار عدم کی ہے، خدا بخشے اس عاقبت محمود کو ✦

اتنا سودا یہ دل زار ہوا، کچھ نہ ہوا — کچھ بھی یہ عشق سے بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا
کاشکے عشق جتاتا نہیں اس کو حسرت — میری صورت سے وہ بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا

بجا تجھ کو مریضِ عشق سے ملتے حذر آیا۔ — وله — کہ آئینے میں شکل اپنی جو دیکھی مجھ کو ڈر آیا

رقیبوں کے حوالے کرکے خط کو نامہ بر آیا — وله — عزیزو کیا کہوں قاصد تو میرا کام کر آیا!

نہیں غنچوں پہ شبنم، اس دہن کے وصف نے اُنکو — یہ لذت دی کہ پانی مُنہ میں ہر غنچہ کے بھر آیا

اسی جہان میں رکھتے ہیں ہم جہان جُدا — وله — حباب وار ہے اپنا بھی آسمان جدا

تری فرقت میں ہے شام و سحر مجھ کو عجب مشکل — وله — جو شب کاٹی تو دن مشکل، جو دن کاٹا تو شب مشکل

کرم سے کون جو تیرے پڑے ہیں کام میں میرے — ترے آگے ہیں سب آساں مگر لگتے ہیں سب مشکل

ہوئے ہم بُت کے بندے برہمن سو راہ کرتے ہیں — وله — حرم کے رہنے والو تم سی عشق اللہ کہتے ہیں

جلے جوں شمع، اب نزدیک ہے خاموش ہوجاویں — یہ افسانہ سنا کر قصہ ہم کوتاہ کرتے ہیں

تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا — وله — کہ ملنا ہوگیا دشوار اب خرگاں سے مژگاں کے

برنگ آبلہ اے وائے یہ کیا زندگانی ہے — وله — کہ جس کے پائوں پڑتے ہیں اُسی کو سرگرانی ہے

؎ اصل مسودہ میں اسی طرح املا لکھا ہے

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے تاراج کیا صبر و دل و جاں پھر اب آگے	وله	لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے کیا خاک بھی ہے جسے برباد کروگے
ترے بن کس طرح پیارے مری اوقات گذریگی	وله	ابھی سے دل کو بیتابی ہے کیونکر رات گذریگی
کیا راہ میں غیروں سے ملاقات لگائی الٹا جو زمانہ ہے تو اس صید نے دل کے	وله	جو صبح سے یاں آنے تلک رات لگائی صیاد کے ملنے کے لئے گھات لگائی
اس زلف میں جا وفات پائی	وله	اس دل نے عجب ہی رات پائی
ہمارے کام پہ ہر چند آسمان پھرے چلا تھا لشکرِ غم چڑھ کے گھر پہ مجنوں کے دل درد بتاں سے آہ کیونکر نہ کرے وہ مشکل ہے جیسی دشمنوں میں گھایل	وله رباعی	تجھے قسم ہے! جو تو اس طرف کو آن پھرے مجھے جو دیکھا تو وو ہیں ادھر نشان پھرے پر آہ تو تب کرے جو اس سے نہ ڈرے دم لیوے تو سر کٹے، نہ دم لے تو مرے

۴۴ حیران

حیران تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہ جہان آباد کے۔ شاگرد رائے سرب سنگھ دیوانہ تخلص[1] اُستاد کے علم شعر سے تو بخوبی آگاہ نہیں ہیں، لیکن اشعار ان کے سب دلچسپ اور شیریں ہیں۔ بندش شعر کی ان کے اُستادانہ ہے، استاد جانتا ان کو ایک زمانہ ہے۔ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں مرحوم کی امارت میں، اگرچہ نوکر وزیر الممالک نواب آصف الدولہ مغفور کے تھے، لیکن سرکار[2] سے کہ مالک و اصلباتی کا تھا، توسل رکھتے تھے۔ بعد ائے مذکور کے مرنے کے ایک آدھ برس تو تنخواہ کی طرف سے اذیت اُٹھائی، پھر تو ایک مرتبہ نواب آصف الدولہ مرحوم سے کچھ ایسی موافقت آئی کہ پچاس کے سو روپے اضافہ کیا، اور سو سوار کا رسالہ۔ بالفعل

---

[2] یہ سہو جرأت کی طرف بھی منسوب ہے۔ [1] اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے مطلب یہ ہے کہ سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے، اور جو اُستاد فن ہیں، حیران ان کے شاگرد ہیں۔

کہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، مع رسالہ تنخواہ لکھنؤ میں لیتے ہیں، اور داد عیش کی دیتے ہیں۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے ہیں +

کبھی وضع ہے، اور یہی ہیہات نصیب
تو ہمیں ہو چکی بس اس سے ملاقات نصیب

ہم لب گور ہوئے خوں بہ جگر اس غم سے
کرنی اس غنچہ دہن سے نہ ہوئی بات نصیب

صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام
آ جائینگے مرے کون سی اب رات نصیب

کچھ ہمیں شکوہ نہیں جو سے تیرے ہرگز
ہم ہمیشہ سے ہیں آجان کچھ اوقات نصیب

مسجدوں میں پھرے نت سبحہ پھراتے حیراں
شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب

ولہ

ہوا نہ ہم کو کبھی سیر باغ و گشت نصیب
کریں گے زیست کا کیا یاد ہم سے زشت نصیب

دل ستم زدہ کا آج پوچھتے ہو حال
غم فراق سے کب کا ہوا بہشت نصیب

ولہ

اپنے جانے کا وہاں دن کو نہ رات کوڈھب
دیکھئے کیسے بنے آن پڑی بات کڈھب

درد دل غیر کے ہونے سے نہ کہنے پایا
کل میسر ہوئی حیراں کو ملاقات کڈھب

دکھ اس سے کون سکے، تاب التماس کہاں

ولہ

کسے ہے ہوش بجا، دل کدھر، حواس کہاں!
ہوا ہے اب تو نئے دوستوں سے ربط نئے
تمہیں اب آنے کی فرصت ہمارے پاس کہاں

کلیجا بھن گیا۔ کب تک کروگے ملے بیدادی

ولہ

اٹھوں میں ہی جہاں سے، یا کہ یہ اٹھ جائے بیدادی

کل کہا میں نے میرے گھر چلئے
سن کے تیوری بدل لگا کہنے
مجھ کو کہتا ہے میرے گھر چلئے

ولہ

اس میں کچھ کم نہ ہوگی محبوبی
رسم و راہ ادب تو سب ڈوبی
دیکھیو اختلاط کی خوبی"

۵۔ حسرت

حسرت تخلص، ہیبت قلی خاں لقب، ساکن عظیم آباد کے، شاگرد میرزا جان جاناں مظہر کے تھے۔ چند روز انہوں نے رفاقت نواب شوکت جنگ کی، کہ خلف نواب صولت جنگ

ناظم پرگنہ کے تھے، کی ہے۔ اور کچھ دنوں ان کو خدمت عرض و معروض کی نواب سراج الدولہ ناظم بنگالہ کے حضور میں رہی ہے سنہ ۱۱۹۰ گیارہ سو نوے ہجری کے اندر نواب مبارک الدولہ میر مبارک علی خاں بہادر صوبہ بنگ کی رفاقت میں نہایت غربت اور پریشانی کے ساتھ اوقات بسر کرتے تھے سنہ ۱۲۰۱ بارہ سو دس ہجری میں اس سرائے فانی سے سفر کر گئے۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے، بذلہ گوئی اور علم مجلس میں انتخاب تھے۔ قریب دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی دودمان کا ہے۔ یہ انتخاب ان کے دیوان کا ہے۔

رات کا سچ ہوا یہ خواب مرا
ل گیا صبح آفتاب مرا

ییترے کوچے سے باز نہیں[۱] آتا
یہ دلِ خانماں خراب مرا

ولہ
نہ جانوں کرے کیا حنا کا لگانا
لہو پانی کرتا ہے یہ پان کھانا

ولہ
عجب طرح کا عشق حسرت نے ٹھانا
کبھی اُس کے کوچہ نہ آنا نہ جانا

ولہ
بسکہ دُکھ دیتا ہے میرے دل کو وہ بدخو مرا
کل نہیں پاتا ہے مارے درد کے پہلو مرا

ولہ
دل ہوا غم میں آب کی سی طرح
پر جلے ہم شراب کی سی طرح

ہاتھ میں جام لے ملا مجھ سے
صبح کو آفتاب کی سی طرح

ولہ
پوچھاؤں اشکِ گلگوں کس طرح ہائے!
گریباں ہو رہا ہے جابجا سُرخ

ولہ
اشک پر اشک چلا متصل آوے باہر
یہاں تلک رُوئے آنکھوں سے دل آوے باہر

ولہ
بعد مرنے کے ہماری خاک کو برباد کر
دے بگولے کو کہے مجنوں کا گھر آباد کر

ولہ
ترے جمالِ جہاں گیر سے بنے کیوں کر
میں ایک تیرا دیوانہ، ترا ہزار میں دل

ولہ
زلف و رخ یار دیکھتا ہوں
کیا لیل و نہار دیکھتا ہوں

پھر پیارے ان دنوں میں بارے
صحبت کو برآر دیکھتا ہوں

[۱] اس لفظ کو قدما کے لہجہ کے موافق بہ وزن نو پڑھنا چاہیئے ورنہ مصرع ناموزوں ہوگا ۱۲

آپ ہی اپنے یار تھے، جاتا نہیں	ولہ	غیر میں ہو رہے تھے پہچانا نہیں
ہم نہ ہوں، تو ہو، تو سب چرچا کریں	ولہ	شمع ہے محفل میں پروانہ نہیں ہے
کعبہ بھی ہم گئے، نہ گیا ان بتوں کا عشق	ولہ	اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں
مر گئے انتظار کے ہاتھوں	ولہ	کیا کہیں! اپنے یار کے ہاتھوں
ہم مسیحا دمی کرے تو اٹھیں		سو کہاں روزگار کے ہاتھوں
فرہاد سے ہمسری کرے کون	رباعی	سر کس کا پھرا ہے یوں مری کون
چل کشمکش جہاں سے حسرت		ہوتا رہے نت در بدر کون
سدا بارش ہی میں رہتی ہیں میری چشم تر ساون	ولہ	تو ایک دو دن برس کر ہم سے آ سکتا ہے یہ ساون
اڑا دے اے دوانے! شورش سودا سے سب ڈر کو	ولہ	بہار آئی، تو کیدھر دیکھتا ہے، پھونک دے گھر کو
مجھے افراط رقت میں بجا نہیں بات کر آئی	ولہ	کہ کر سکتا نہیں ڈوبا ہوا تقریر پانی میں
سنا ہے آج میخانہ میں جام مے پرستوں نے	ولہ	لٹا یا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں
ہم دوانوں کے نہیں عشق میں گھر جلتے ہیں	ولہ	اس محبت میں پرندوں کے بھی پر جلتے ہیں
دیکھ اس لب کو ترے، آگ ہیں لعل دیا قوت		تیرے ان دانتوں کی جھلکی سے گہر جلتے ہیں
ان پتنگوں کی ہیں جرأت پہ سوا جاتا ہوں		بے کلیجے ہیں یہ کمبخت، قہر جلتے ہیں
تو جو ل گرمیاں کرتا ہے گا مجھ سے ہر دم		دیکھنے والوں کے حسرت سے جگر جلتے ہیں
نہ جی لگا یئو اس سے جو دردمند نہ ہو	ولہ	کسی کا دل کسی ظالم کے پاس بند نہ ہو
گو دل بروں کے ماہ سے رخ پر نقاب ہو	ولہ	پوشیدہ ہو سکے ہے جو کوئی آفتاب ہو
لب بام آکے یہ تیرا کھڑے رہنا تو آفت ہے	ولہ	سوا نیزے پہ گویا آفتاب آیا، قیامت ہے
داغ دل بھی ہے تازگی پہ ہوئے	ولہ	اب شگوفہ بہار کرتا ہے
مرا غرور مرے عجز کے مقابل ہے	ولہ	ادھر بہار، ادھر ایک شیشۂ دل ہے
پلا شراب، ہوائے شراب آتی ہے	ولہ	گھٹا بھی اپنا جھکڑ اکڑی دکھاتی ہے

لے اُڑا کام اپنا پروانہ — وله — ہائے ہم بال و پر نہ رکھتے تھے
جیسے بھٹکے پھرا کئے حسرت — ہاسکے دل میں گھر نہ رکھتے تھے

قفس ہی میں ہمیں رہنے دے صیاد — وله — کہاں اب اُڑ سکیں جب بال و پر گئے
تجھے کچھ بھی ہے حسرت فکر دل کی — کہاں کھویا اُسے تو ہائے گھر گئے!

ناصح عبث شامت ہیں مبتلا کسو کے — وله — کچھ دل بھی گیا پھرے ہی، پھیرے سی کیا کسو
یہ گل ہزار اپنے جامے میں پھول بیٹھے — ویسے کھلے نہ دیکھے بندِ قبا کسو کے

جدائی کی ہوا دہکا گئی اب آگ سینے کی — وله — لگے اُڑنے بھبکے آہ کے، کیا طرح جینے کی

تا شاد کام میرے رحال جیسے نہ گیا — رباعی — جی تک میں دیا، ملال جی سے نہ گیا
یہ لوح مزار پر ہماری لکھنا — "ہم گئے، پہ ترا خیال جی سے نہ گیا"

زاہد جو نہیں ہے میرے دل سے آگاہ — رباعی — کہتا ہے کہ کافر ہے تو اے روئے سیاہ
ہوں جس کی پرستش میں کہوں کیا یارو — آتا ہے وہ بت، دیکھو اللہ! اللہ!

کب شہر کو چھوڑے، جو سیانا ہوگا — رباعی — صحرا دیکھے گا، جو دِوانا ہوگا
ہم دونوں میں سیر کرکے دیکھا حسرت — رہنا تو وہاں، جہاں کہ جانا ہوگا

میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی — رباعی — زاہد واعظ سے دور، بھٹکی بھٹکی
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے ہرگز — یہ دخترِ رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

۶۔ حسن

حسن تخلص، خواجہ حسن نام، متوطن شاہجہان آباد کے، بیٹے خواجہ ابراہیم بن غیاث الدین بن محمد شریف بن ابراہیم کے ہیں۔ جو کہ مشہور خواجہ کمہار کر کے تھے۔ چشتی اور ساکن پہاڑ گنج ہیں۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہیں۔ علم موسیقی ہندی سے بخوبی ماہر، اور استعداد اس علم کی ان کی تصانیف سے ظاہر۔ علم نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں۔ اور فقر و درویشی میں

تو آدھا لکھنؤ معتقد اپنا رکھتے ہیں۔ علوم متداولہ سے بھی خوب آگاہ ہیں، خصوص علم تصوف کے بادشاہ ہیں۔ توسل بصورت دنیا میں ان کو نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خان سے ہے، اور یہیں ملاقات تو ایک جان سے ہے، بخشی نام ایک رنڈی ارباب نشاط سے ہے، اس پر مرتے ہیں، علاوہ اکثر نام اُس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب ان کے لکھے گئے یہاں ہیں ◆

حال دل اپنا میں ہر ایک سے کہوا دیکھا / وہاں کسی ڈھب سے پہ ہوتے نہ پذیرا دیکھا
وقت نظارہ نہ رو، کہتے تھے اے چشم تجھے / شدت گریہ سے، لے خاک نہ سوجھا، دیکھا
گھورتے ہو مجھے کیا قہر کی آنکھوں سے تم / ایک عالم نے آپ کو گھورا دیکھا
دیکھنے سے مرے کاہے کو غضب ہوتے تھے / کیا غضب ہو گیا گر میں نے بھی دیکھا دیکھا

ولہ

تب اس حیلہ گر کو نہ کچھ کام ہوگا / کہ جب میرا یہاں کام اتمام ہوگا
یہی شورش عشق ہے تو الٰہی ! / اس آغاز کا کیوں کہ انجام ہوگا
رہی بے قراری اسیروں کی یونہیں / تو صیاد ! ٹکڑے ترا دام ہوگا
موئے ہم تو، پر بیقراری وہی ہے / خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا
اگر نزع سے جان بخشی حسن کو / تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا

ولہ

جو بندہ خانے میں آئیے گا، فقیر تم کو دعا کریگا / کسی کے دل کو جو خوش کروگے خدا تمہارا بھلا کریگا

ولہ

عالم اُس حور کی جو جلوہ گری کا دیکھا / پھر یہ جلوہ نہ کسی حور و پری کا دیکھا

ولہ

پہنچے وہاں کچھ جب تئیں پیغام ہمارا / یہاں تب تئیں آخر ہی ہوا کام ہمارا

ولہ

دل دلاسوں سے کرے ہے آہ و زاری بیشتر / خانۂ ماتم میں ہو پڑے سے زاری بیشتر

ولہ

بھلا میں دوانہ سہی، پر یہ ناصح / مرے ساتھ بکتا ہے، عاقل کو دیکھو
یہاں تھک کے بیٹھے ہو کیا راہ میں تم / چلو راہ رو، اپنی منزل کو دیکھو

ولہ

نمک جلا دے ہمیں گویا ہوتا / اے لبِ یار سخن ہا ہوتا

میں تو سب طرح سے تیرا ہوں میاں		پر جو تو بھی کہیں میرا ہوتا
مانوں تب وعدۂ فردا اے یار		جب ترے وعدے کو فردا ہوتا
اے مرے اشک سر مژگاں پر		قطرہ کیا ہووے ہے دریا ہوتا
تو جو ڈھونڈھے ہے حسن خلوت کو		میں خلوت میں اکیلا ہوتا
سر گریباں میں جھکا دل میں بیٹھ		موند لے آنکھ کو تنہا ہوتا
چلنے سے کب اشک ہارتا ہے	وله	دریا ہے کہ جوش مارتا ہے
آ کر بلا سے قتل ہی کر جائیے مجھے	وله	صورت اسی بہانہ سے دکھلائیے مجھے
غم نے ایذا جو اے صنم بخشی	وله	یہ بھی سرکار کی کرم بخشی
حقیقت کہیں کیا ہم اس انجمن کی	وله	نہ تھی واں خبر اپنے ہی تن بدن کی
اگر جاں کنی میں وہ جاں بخش آوے		تو ہو نزع سے جان بخشی حسن کی
یہ تو نے مجھ سے نالۂ شبگیر کچھ نہ کی	وله	یہاں دل جلایا، اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی
کیوں تم خفا ہو، کب میں کسی بات پر میاں		موجب تمہارے قول کے تقریر کچھ نہ کی
کچھ اور تو ہوا نہیں ہے ساری عمر میں		تقصیر یہ ہوئی، کہ میں تقصیر کچھ نہ کی
مرتا ہی جاں کنی میں حسن حیف! تم نے رات		اب اس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی
ٹک اپنا یہ رونے پہ اگر دھیان لگاوے	وله	ساون کی جھڑی دیدۂ گریان لگاوے
شمشیر نگہ تیز ہے آگے ہی، جو چاہے		اور سنگ سی سرمے کے ذرا سان لگاوے
دن رات مری تجھ سے دعا ہے یہی یارب!		اُس بت کا مجھے آٹھ پہر دھیان لگاوے
کب میں کہتا ہوں کہ میری جان جانے سے بچے	وله	پر ٹک ایسا ہو کہ یہ دل تلملانے سے رہے
ہم نے ایسی بھی تو کچھ چوری نہ کی تھی آپ کی		بے سبب اب آپ جو ایدھر کے آنے سے رہے
آہ کس کس سے نفاق کا میاں کیجے شمار		اور تو سب یکطرف، منہ بھی دکھانے سے رہے
اُس نے کس کس طرح ٹالا ہم کو اپنے در سے پر		دیکھ تو ہم بھی حسن کس کس بہانے سے رہے

۷۔ حسن

حسن تخلص، میر غلام حسن نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا میر غلام حسین ضاحک تخلص کا، اولاد ہو میر امامی ہروی کے دلی کے پرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے صغرسن سے والد لکھنؤ میں آ گئے نواب سالار جنگ اور خلف اُن کے میر نوازش علی خاں سردار جنگ کی رفاقت میں اوقات انہوں نے ساتھ عزت اور غربت کے بسر کی ہے، اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے لی ہے اقسام علم سے تو جمیع علوم میں انہیں اقرار ہیچ مدانی ہے، ہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے، قریب آٹھ ہزار بیت کے انواع نظم میں دیوان ان کا ہے، اور ایک تذکرہ بھی ہندی گویوں کا زبان ریختہ میں لکھا ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے، اور سنہ ۱۲۰۱ بارہ سو ایک ہجری میں سیر روضۂ رضوان کی کی ہے۔
یہ اشعار منتخب دیوان ان کے گوشزد کیے ہیں +

گر کیجیے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا
تو چاہیئے خامہ بھی اُسے ایک زباں کا

ولہ
چھوٹا نہ وہاں تغافل اس اپنے مہرباں کا
اور کام کر چکا یہاں یہ اضطراب جاں کا

ولہ
نہ تھی تھمیں آہیں، نہ تھمتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

ولہ
ایسی جی ہو! باتیں اس بیوفا نے چھیڑیاں
رو دیے ہی روتے جس میں دھل گئے

ولہ
کچھ تو صدا ہی آہ : نہ خاک بھی ارجو
ادھر کو لگ رہا ہی حسن گوش نقش پا

ولہ
اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا
جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

ولہ
چھوڑ دے کوئی کسی کیلئے جس طرح سے کچھ
ہم نے منت میں تری کون مکاں چھوڑ دیا

ولہ
اپنی جاگہ نہ ملے اور کہیں مجھ کو کیا
تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجھ کو کیا

ولہ
وہ ملک دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا
سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا

ولہ
دامن صحرا سے اٹھنے کا حسن کا بھی نہیں
پاؤں دیوانے نے پھیلایا بیابان دیکھ کر

اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے، تو کیا	ولہ	ہو چکی وہاں بہار ہی آخر
اُس شوخ نے پھینکا ہے مگر تیر ہوا پر	ولہ	جاتا ہی جو دل کا مرے نخچیر ہوا پر
دیکھا جو وہاں اُس کو، گماں سو طرف گیا	ولہ	آئے نہ ہوتے کاش کہ ہم کوئے یار تک
آن کر غمکدۂ دہر میں جو بیٹھے ہم	ولہ	شمع ساں اپنے تئیں آپ ہی رو بیٹھے ہم
اس کی جب بزم سے ہم ہوکے یہ تنگ آتے ہیں	ولہ	اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں
حسن میں جب تئیں گرمی نہ ہو، جی دیوے کون		شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں
اپنے دل سے تو کبھی ہم ترا شکوہ نہ کریں	ولہ	ہو گر آزردہ تم ایسے ہی تو بولا نہ کریں
ترے بن باغ میں جس وقت غنچے دل کے کھلتے ہیں	ولہ	خراش ناخن غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں
نہ لپیٹ اس طرح منہ پر زلف کو بکھرا کے ای ظالم		ذرا اُٹھ بیٹھ تو اس دم کہ دونو وقت ملتے ہیں
ہے ہنر اُس دل کی جو زلفوں کے گیا پہرے میں	ولہ	شب کو کیوں نکلا اکیلا، جو پھنسا پہرے میں
کہتا ہی تو کہ تجھ سے میں ہی نباہتا ہوں	ولہ	تو بھی کہیں ہو تجھ کو میں یوں ہی چاہتا ہوں
مجھ پر ہی تیرا یہ ستم و جور کچھ نہیں	ولہ	لیکن ترا ہر ایک سے یہ طور کچھ نہیں
روٹھا کرے وہ کیوں نہ کسی اوپر ای حسن		یہ سب بگاڑ چاہ کا ہے، اور کچھ نہیں
صیاد کی مرضی ہو یہ اب گل کی ہوس میں	ولہ	نالے نہ کریں مرغ گرفتار قفس میں
وہ اور زمانہ تھا کہ خوباں میں تھی اُلفت		ایسا نظر آتا نہیں اب ایک بھی دس میں
دم رکتا ہوا آتا ہی لب تک ترے غم سے		عقدے پڑے ہیں بسکہ مرے تار نفس میں
دل اپنا اسی باتوں سے اُٹھ جاتا ہی تجھ سے		جا بیٹھے ہی تو لے کے جو ہر ناکس و کس میں
تیرے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہی کہیں	ولہ	جی دھڑک جاتا ہی میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو
غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو	ولہ	کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو
دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت		شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو
کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گزرتی	ولہ	پر ایک جان تو ہی جس بن نہیں گزرتی

وله
جان و دل ہیں اداس سے میرے
اٹھ گیا کون پاس سے میرے

وله
ساتھ دیکھوں ہوں کسی کے جو کسی دلبر کو
میں بھی جی رکھتا ہوں مجھ کو بھی ہوس آتی ہے

وله
کیا چھیڑے ہے، پوچھے ہے کہ گھر تیرا نہیں ہے
کہنے کو تو گھر یہاں ہے، پہ جی اپنا وہیں ہے

وله
سیر ہے تجھ سے مری جان جدھر کو چلیے
تو ہی جب ساتھ نہ ہووے تو کدھر کو چلیے
جب میں چلتا ہوں ترے کوچے سے گھبرا کے کبھی
دل مجھے کھینچ کے کہتا ہے "ادھر کو چلیے"

وله
نغمۂ عشق سے ہیں ہمہ سوز تار ملے
ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے
دن توقع ہی توقع میں کہاں تک گذرے
مر گئے ہجر میں، بس اب تو کہیں یار ملے
جی تو ایسا ہی خفا تھا کہ نہ ملئے گا کبھو
پر ترے ہنس کے لپٹ جانے میں ناچار ملے

وله
گر بخت اپنے جاگیں تو اک کام کیجیے
سایہ میں اس کی زلف کے آرام کیجیے
اب میں بھی بے قراری پہ اپنی لیا قرار
بس خیر! آپ شوق سے آرام کیجیے

وله
بھولے سے نام لے کے مرا ہٹ بتا گیا
پیاری لگی یہ مجھ کو تری بات آج کی

وله
کئی دن تیرے چپ رہنے میں اشک آنکھوں سے برسائے
نکل خورشید رو گھر سے کہ عالم خوب ترسائے

وله
ترا ہر چند دل تجھ سے بھی کچھ سخت ترسا ہے
ولیکن سخت اگر کہئے، تو کب میرے جگر سا ہے
گریباں چاک اور خاموش مجھ کو دیکھ کہتا ہے
کروں کیا بات اس سے، یہ تو کچھ دیوانہ سا ہے

وله
رہنے نہ دے گا اس بن یہ دل تو ایک دم بھی
کیوں روٹھ کر ہم اپنا کھو دیں عبث بھرم بھی

وله
دریا میں ڈوب جائیے، کہ یا چاہ میں پڑے
اے عشق پہ نہ کوئی تری راہ میں پڑے
آ جا کہیں شتاب! کہ مانند نقش پا
تکتے ہیں راہ تیری سر راہ میں پڑے

وله
یوں غیر کچھ نہیں، تو بلا کو بری لگے
تو کچھ نہ کہہ، کہ ہم غربا کو بری لگے

وله
کیا رہنے اب کوئی اور کیا رو سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

وله
رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
بس اے زندگی! ایسی ہستی سے گذرے

وله
آنکھوں کو اس کی دیکھا تو مستی نظر پڑی
پھر ساتھ اس کے بادہ پرستی نظر پڑی

سارا جہاں خراب تھا آنکھوں میں تجھ بغیر
بارے وہ آج آیا تو بستی نظر پڑی

ولہ

جو چاہے آپ کو تو اُسے کیا نہ چاہیے
انصاف کرتو، چاہیے ہو یا نہ چاہیے
مجھ سے نے تجھ کو چاہا تو چاہا عجب نہیں
تجھسا جو مجھ کو چاہے، تو پھر کیا نہ چاہیے

ولہ

مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اُس گلی کے تنکو
رہتے ہیں ہم وہ اسے روز ازل سے تنکے

رباعی

دنیا داری میں اور نہ دیں داری میں
چاہت میں کسی کی ہیں، نہ بیزاری میں
حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح
سویا کرتے ہیں عین بیداری میں

رباعی

ہر آن میں آپ کو دکھا جاتے تھے
ہر لحظہ نیا شوق دلا جاتے تھے
کیوں دیر لگی ہے، کس نے روکا تم کو
اب تک تو کئی بار تم آجاتے تھے

مثنوی در ہجو لکھنؤ و تعریف فیض آباد۔

نہیں یہ لکھنؤ، ہے یہ زنانا
زنانے پر عبث رکھتا بہانا
زبس یہ ملک ہے پتھر پہ بستا
کہیں اونچا، کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں
کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
زبس گنجان ہے یہ شہر باہم
سما سکتا نہیں جو غیر کا دم
سیہ گل سے گلی یوں تر ہے ہے
بغل میں طرح زنگی کی بہے ہے
فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہے
ہر اک گھر بخیل کا سا دل یہاں ہے
کنواں بھی ہو اگر پھر اس تنگ گھر میں
پڑے تیلی کا تل جیسے نظر میں
کنواں کہنا اسے ہے عقل سے دور
کہ ہے اس گھر کی چھاتی کا وہ ناسور
کہوں کیا میں قباحت اس مکاں کی
پڑی بنیاد بعد اس کے جہاں کی
ہزاروں راہ اس میں پیچ در پیچ
ولیکن مثل زلف زشت رو ہیچ
جو اس کے زیر سایہ آن نکلے
رکے دم، اور اُس کی جان نکلے
جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر
پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در

نہیں امکاں جو گھر اپنا وہ پاوے
بلا خورشید کو جب تک نہ لاوے

زمیں کوفے سے یہ شہر ہم صدا ہے
اگر شیعہ کہے نیک اس کو بجا ہے

چڑھے ہے گومتی جب گرد آکر
حباب آسا بہے پھرتے ہیں سب گھر

رکھے ہے پار ہو سکنا تب امکاں
چڑھے جب آدمی پر آدمی یہاں

سوائے قندیاں دیکھا نہ کچھ اور
سو ہے روپوش وہ بھی دیکھ یہ طور

چلا میں یہاں سے دل اپنا اُٹھا کر
کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر

عجب معمورۂ آباد پایا
مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا

کھلا بازار اور رستہ کشادہ
بیاضِ جدولی جیسے ہو سادہ

دو رستہ راستے میں تنا رستا
کسی نے آج تک دیکھا ہی بستا

وہی ہے شہر کا ترپولیا یوں
کہ جیسے تین روحیں جسم میں ہوں

ادھر کو جوہری، اودھر کو بزاز
ادھر صراف، اور اودھر طلاساز

روپے اور اشرفی دیکھے برستے
دیئے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے

فیرنی اور فالودے کا عالم
یعنی فیرنی
کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم

ملا شربت میں جو اس کو بتاوے
شبِ مہ کا سما پانی میں پاوے

ملائی دودھ کی دیکھو تو گویا
اسی میں مال حلوائی نے کھویا

بلندی پر ہے حلوائی کی دُکاں
ستارے گرد ہیں جیسے چراغاں

دھری ہیں گولیاں اور یوں اندرسے
کہ گویا چاند اور تارے ہیں برسے

مٹھائی کی کروں تعریف تا چند
قلم کی ہو گئی اب تو زباں بند

معنبر ہوں خانگی اور کسبی آکر
کریں ہیں سیر لالہ دل لگا کر

چمک دامن کی دکھلا یوں چلے ہے
کہ بجلی اپنے ہاتھوں کو ملے ہے

وہ سبزہ کان میں زیبِ بنا گوش
کہ جس کو دیکھ طوطی کے اڑیں ہوش

شعاع اس کی یہ اور منہ کا پسینا	ہے گویا پھول پر شبنم کا مینا
کوئی کرتی ہے پہن جالی کی سادہ	گریباں کرکے چھاتی تک کشادہ
کیا اس دام میں تکمہ کو یوں صید	سمجھ کے جوں گریباں میں ہو خورشید
مسافر اس طرف جو آن نکلے	نہ نکلے وہاں سے غیر از جان نکلے

باب الخاء

۱۔ خاکسار

خاکسار تخلص، محمد یار نام، شاہ جہان آبادی۔ قدم شریف کے خادموں میں سے تھا، بڑا ہی مشاق زبان ریختہ کا۔ ہمیشہ محمد تقی میر تخلص سے نوک جھوک کرتا رہا ہے، اور ان کے اشعار میں مشاعروں کے اندر اکثر تصرف کیا گیا ہے۔ صاحب دیوان اور شاعر خوش بیان تھا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "شعر اس عزیز کے میرے ہاتھ نہیں لگے ہیں، اس جہت سے اشعار اس کے داخل اس تذکرے کے کمتر ہوئے ہیں"۔ یہ اشعار طبعزاد اس کہن اُستاد کے ہیں +

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہ کنعان عزیز		ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز
کل مجھے قتل کر اس دشمن دیں کا ذ نے		بولا لوگوں سے یہ تھا مومسلمان عزیز
کیوں نہ ہو مصحف دجان سے مجھے ہو وے زیادہ		کس مسلماں کو نہیں دین اور ایمان عزیز
خاکسار عشق سے بھی دیکھا ہے تیرا مزاج		آپ میں آ ذرا، اپنے تئیں پہچان عزیز
دل شیفتہ کر کے کیا لیا تو	ولہ	اے خانہ خراب! کیا کیا تو
تیری زلف سیہ سے اے پیارے	ولہ	مجھ کو یک سر ہزار سودا ہے
قیامت بھی ہوگی تو میرے بلا سے	ولہ	مجھے دادخواہی کی طاقت کہاں ہے

لے تقلید میں عین کرتا ہے ۱۲

روونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی	ولہ	اس خانماں خراب کو چپکا خدا کرے!
کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے سے	ولہ	آہ! جوں شمع ہے راحت مجھے جل جانے سی

بابُ الدّال

۱ — درد

درد تخلص ـ خواجہ میر نام ـ متوطن شاہ جہان آباد کے ـ خلف الصدق حضرت ناصر دہلوی کے ـ ثابت قدمی میں اس قطب آسمانِ استقلال کی ، اور زاویہ گزینی میں اس مرکز دائرۂ فضل و کمال کی یہ نقل مشہور ہے ، اور زبان زد جمہور ہے ، کہ جس ایام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا ، اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا ، مجمع اہل کمال سے اور کثرت خجستان عدیم المثال سے ، رشک ہفت اقلیم اور غیرتِ جنت النعیم تھا ، تو معموری ہر شہر کی عرصہ ربع مسکوں کا تنگ ، اور وہ خراب آباد تشبیہ سے ہفت اقلیم کی تنگ تھا ـ جبکہ متواتر نزولِ آفات کے باعث ، اور مکرر ورود بلیات کے سبب خراب ہوا ، اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا ، تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے ، اور ہر ایک صابرِ زاویہ گزین نے ، اور ہر توانگر مالدار نے ، اور ہر امیر عالی مقدار نے ، فرار کو غنیمت جانا ، اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا ـ مگر وہ سعید والا تبار ، کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا ، اُس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا ، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے ، اور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم اپنے کنج عزلت سے نہ گئے ـ اگر شیخ فرید شکر گنج اُس کوہ تحمل کو دیکھتا ، تو چاشنئ فقر اُس کی حیران ہو کر مانند نیشکر کے انگشت تحیر کو کاٹتا ـ اور اگر سید حسین خنگ سوار بیچ اس عرصہ کے ہوتا ، تو زین پوش خدمت کا اُس کے کاندھے پر ڈال کے دوڑتا ـ غرض اس مجمع فضل و کمال کی التفاتِ طبیعت طرف نظم کے نہ واسطے شہرت اور نام کے بلکہ واسطے گرمانے افسردہ دلان خام کے ہے ـ اُس شہسوار معرکہ سخنوری کے توسن تندخرام قلم نے بیچ قلمرو معنی آفرینی کے ایک گام بے راہی نہیں کی ، اور اُس یکہ تاز عرصۂ مضمون

تراشی کے ست رنگ آسمان سیغامہ سے پیچ میدان بلند مقامی کے ایک قدم کوتاہی نہیں کی تعجب نہیں ہے اگر اُس عندلیب گلشن معنی کے کلام معجز نظام کی تحریر سے صفحہ کاغذ کا ہمرنگ برنگ گل ہو، اور نغمہ زبانِ قلم کا ہم آہنگ صفیرِ بلبل ہو۔ اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے، لیکن سراپا درد و اثر ہے۔ زبان فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ رباعیوں کی طرف مسایل تصوف میں بیشتر طبیعت آئی ہے، اور شرح بھی اُس کے مشکل مقاموں کی آپ ہی فرمائی ہے۔ طریقۂ فقر میں بہت بڑے کاسب اور شاغل تھے، اور راہ طریقت کے طالبوں کے واسطے رہنمائے کامل تھے۔ بر ۱۲۰۲ھ بارہ سو دو ہجری میں اُس بلبل گلشن آزاد نے دام ہستی سے نکل کر شاخسار گلشن عدم کے آباد کیا ہے۔ یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے +

مقدور کسے ہے ترے وصفوں کے رقم کا ۔۔ حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن ۔۔ آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا
ملتند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی ۔۔ کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا
ولہ
اہل زمانہ آگے بھی تھے، اور زمانہ تھا ۔۔ پر اب جو کچھ ہے، یہ تو کسی نے سنا نہ تھا
باور نہیں ابھی تجھے غافل پہ عنقریب ۔۔ معلوم ہووے گا کہ یہ عالم فسانہ تھا

ولہ
یک بیک نام لے اُٹھا میرا ۔۔ جی میں کیا اُس کے آگیا ہوگا
ولہ
گل و گلزار خوش نہیں آتا ۔۔ باغ بے یار خوش نہیں آتا

ولہ
جاں پہ کھیلا ہوں میں، میرا جگر دیکھنا ۔۔ جی نہ رہے یا رہے، مجھ کو اُدھر دیکھنا
ذکر وفا کیجئے اُس سے کہ واقف نہ ہو ۔۔ کہتے ہو کس سے یہ تم ٹک تو اِدھر دیکھنا
ولہ
باہر نہ آسکی تو قیدِ خودی سے اپنی ۔۔ اے عقل بے حقیقت! دیکھا شعور تیرا
جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یہاں ۔۔ جی میں سما رہا ہے ازبس غرور تیرا
ولہ
ہم نے چاہا بھی، پر اُس کوچہ سے آیا نہ گیا ۔۔ واں سے جو نقش قدم دل کو اُٹھایا نہ گیا
ولہ
چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم ۔۔ بہار باغ گو یوں ہی رہے لیکن کدھر شبنم

تیری خون آشنا میاں مشہور ہیں ای تیغ یار — ایک قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو

ولہ

اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں — اے نشۂ ظہور! یہ تیری ترنگ ہے

ولہ

نہ ہاتھ اٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے — کسے دماغ کہ ہو دو بدو کمینے سے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجاوے — کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے کی

ولہ

جو ملتا ہے دل، ہے کہاں زندگانی — کہاں میں، کہاں تو، کہاں نوجوانی

عجب خواب دد پیش ہے پھر تو سب کو — سنا لو ٹک اب اپنی اپنی کہانی

۲۔ دردمند

دردمند تخلص، فقیر صاحب نام۔ دکن اِن کے بزرگوں کا وطن ہے، بلکہ ان کا بھی مولد دکن ہے، لیکن تربیت انہوں نے شاہجہان آباد میں پائی ہے، اور خدمت سے میرزا جان جاناں مظہر کی کیفیت آدابِ فقر کی اُٹھائی ہے۔ مرید بھی مرزائے مذکور کے تھے۔ چند مدت عظیم آباد میں بود و باش کی ہے، اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گذرانِ معاش کی ہے۔ بعد اس کے پھر دلّی گئے، اور چند مدت وہاں رہے پھر نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ بھتیجے نواب وردی خاں مہابت جنگ کے بلائے ہوئے شاہجہان آباد سے مرشدآباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہیں ٹھہرائے۔ رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک رفاہِ احوال ہوا۔ آخر ۱۱۷۶ھ گیارہ سو چھہتر ہجری میں بلدۂ مرشدآباد کے اندر انتقال ہوا۔ سلیقۂ سخن رسی میں اُستاد تھے، اور طریقۂ مصاحبت و اختلاط کے ماہر حد سے زیادہ تھے۔ فارسی دیوان ان کا صاحب نظروں کا منظور ہے، اور ہندی میں تو یہی ساقی نامہ مشہور ہے +

پڑی اُس کی خوبی کی از بسکہ دھوم — لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم

ارے ساقی! اے جانِ فصلِ بہار! — یہی تھا ہمارا و تیرا اقرار

ہمارے بہنے کی یہ فصل تھی؟ — فراموش کرنے کی یہ فصل تھی؟

ف اس مضمون کو [illegible]

تری جان کی سوں غنیمت ہوں میں | سلیقوں میں ظالم قیامت ہوں میں
مری عقل میں کون انباز ہے | ارسطو مرا اک دوا ساز ہے
فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار | نہ لاوے گا مجھ سا کوئی روبکار
نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف | شگوفہ کو آیا ہے مستی سے کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک | کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک
تجھے جانِ گل کے لہو کی قسم | تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم
تجھے جام کے چشمِ تر کی قسم | تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم
ادا سے لہکنے کی تجھ کو قسم | نشہ سے بہنے کی تجھ کو قسم
تجھے جامِ صہبا کے سر کی قسم | تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم
تجھے نازِ مستی کی اپنے قسم | تجھے خود پرستی کی اپنے قسم
قسم ہو تجھے بے سبب جنگ کی | قسم ہی مرے نام کے ننگ کی
ارے بے وفا بے مروت صنم | میں دیتا ہوں تجھ کو قسم پر قسم
تجھے دخترِ رز کی حسرت کی سوں | تجھے مغبچوں کی شرافت کی سوں
تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں | تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں
تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں | تجھے بیقراروں کی فرصت کی سوں
شبِ عید کے تجھ کو چاؤں کی سوں | تجھے اپنی مہندی کے پاؤں کی سوں
جو تو نے کیا ہے کو مجھ پر ستم | تو اتنا کر اے ظالموں کے امام
کہ تو ستم کشی سے نہ کر پائمال | مرے خون کو اپنے اوپر حلال
تجھے رحم مجھ پر کچھ آتا نہیں | مگر جینا میرا بھاتا نہیں
نہ توڑ آئینہ اپنے خریدار کا | زیاں خوب نئیں اپنی سرکار کا
یقیں جانیو گر نہ ہو ایک آن | تری مہربانی کا مجھ کو گماں

تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات	نکل جائے جی ناامیدی کے ساتھ

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد پرویز کے شیشہ خانہ عشرت پر	رباعی	اس دھڑکے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد سنگ آیا و لیک سخت آیا فرہاد

۳۔ دل

دل تخلص، شیخ محمد عابد نام۔ متوطن بلدہ عظیم آباد کے بے مثل، اور بے نظیر عالم محبت و وداد کے شیخ محمد روشن جوشش تخلص بڑے بھائی ہیں، جن کی خوبیاں باب الجیم کے اندر بیان میں آئی ہیں۔ غرض دونوں بھائی پسندیدہ اطوار اور حمیدہ خصال ہیں، طریقہ یک رنگی میں بے مثال ہیں یہ ابیات دل خراش اس اہل دل کی تلاش سے ہیں[1]۔

تیری زلفوں میں پھنسا دل یہی تقصیر ہوئی تالے ہی سدا پھر دن عمر کے بھرتے ہیں	نقد جاں لیجیے حاضر ہے گنہگاری دل ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ	رہتا ہے مدام آب دیدہ
تمہارے در پہ جو دربان نے آستیں پکڑی	برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

۴۔ دیوانہ

دیوانہ تخلص، رائے سرب سکھ نام، رشتہ دار راجہ مہانرائن کا تھا۔ نہایت پرگو۔ اور وضع مغلیت سے بسر کرتا تھا۔ دو دیوان زبان فارسی میں اس نے لکھے ہیں، اور اکثر ریختہ گو۔ لکھنؤ کے مرزا جعفر علی حسرت، اور میر حیدر علی حیران، اس کے شاگردوں میں سے ہیں بعمر ۱۲۰۱ھ بارہ سو

[1] اصل کتاب میں نمونہ کلام نہیں تھا معلوم نہیں مصنف ہی کو نہیں ملا یا جس نسخے سے ہم نے نقل کیا ہے اس کے کاتب نے چھوڑ دیا ہے یہ مندرجہ بالا چار شعر ہم نے سخن شعرا مصنفہ عبدالغفور خاں نساخ سے نقل کیے ہیں۔

چار ہجری میں اچار گرم روی راہِ عدم میں کی، اور آتشِ فنا پیکرِ وجود کو دی[1]۔ فارسی منظوم اس کا دس ہزار بیت سے زیادہ ہے۔ یہ ہندی اس کا طبع زاد ہے۔

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر — گفتگو ہم سے اُسے پر نہیں انکار بغیر
بزم میں رات بہت سادہ و پرفن تھے ولے — گرمیٔ بزم کہاں اُس بتِ عیار بغیر
دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا — ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر
جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے — بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر
جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے — کیونکہ دیوانہ بھلا رہئے اب اُس یار بغیر

ولہ

دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نہ جائے — رستم کا کیا جگر ہے جو زہرا اچھل نہ جائے

رباعی

وے یار کہاں کہ یار باشی کیجے
وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشہ میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا
اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجے

بابُ السّین

۱- سَودَا

نامِ نامی اور اسمِ گرامی اُس شاہبازِ عرش پروازِ معنی کا مرزا رفیع ہے۔ متوطن دار الخلافہ شاہجہان آباد کے۔ بیشک مقام اُن کی طبیعتِ فلک فرسا کا موافق اُن کے نام کے نہایت رفیع اور منیع ہے۔ روزِ تولد سے ساٹھ برس کی عمر تک دہلی میں ساتھ کمال عز و وقار کے رہے اور طبعِ رسا کی مربی گری سے انیس و جلیسِ سلاطینِ نامدار اور وزرائے عالی تبار کے رہے۔ اگرچہ

[1] مصنف نے جس خاص استعاروں میں راجہ سرب سنگھ دیوانہ کے انتقال کو بیان کیا ہے، اُن میں ایک خاص جھلک پائی جاتی ہے، جو مصنف کی عزا اصلی پر مشعر ہیں۔

ذات اُس یگانۂ روزگار کی کثرتِ اشتہار کے باعث مستغنی ہے تکلیف سے خامۂ مدائح نگار کی، لیکن انصاف کہتا ہے کہ کچھ تھوڑا سا احوال اس مستغنی الصفات کا لکھا چاہیئے، اور تذکرے سے اُس شاہ بیتِ کلیاتِ معانی کے، بیان کو ان اوراق پریشان کے، زیب و زینت دیا چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرزاے مذکور سر حلقۂ سخنوران اور سرآمدِ معنی گستران تھے۔ آشناے معنی بیگانہ اور مضمون تازہ کے پیدا کرنے میں یگانہ تھے۔ اقسامِ نظم سے دیوان اس مطلع دیوان سحر بیان کا بھرا ہے، اور انواعِ نظم کو کیا کیا زور و شور کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خصوصاً طرز قصیدہ کو کس صفائی اور تکلف سے ادا کر کے اس طاقِ بلند پر رکھا کہ دستِ وہمِ نازک خیالانِ ہندوستان کا اس کے خیال تک نہ جا سکا۔ آگ کو یاد میں اُس آتش زبان کے ہجوم شرارے سے جوشِ قطراتِ عرقِ انفعال ہے، اور پانی کو خجالت سے اس طبعِ روان کی خاک میں چھپنے کا خیال۔ زبان ہندی شرفِ ہمزبانی سے اُس کی سرفراز، اور نظم ریختہ کو طبعِ معنی آفرین پر اُس کے گھمنڈ اور ناز۔ جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہ جہان آباد کے نقل و حرکت کا اتفاق میرزاے مذکور کو اس شہر سے ہوا، تو اور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدۂ لکھنؤ میں طورِ سکونت کا کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی، اور چھ ہزار روپے سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی۔ چنانچہ بیشتر قصیدے نواب آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں کہے ہیں، اور کیا کیا تر و تازگی کے ساتھ مضامینِ عالی باندھے ہیں۔ جب کہ سنِ شریف اس خضرِ راہِ سخن دانی کا ستر برس کو پہنچا، تو داعیِ اجل کو لبیک اجابت کہہ کے سراے وجود سے پیما منزلِ عدم کا ہوا۔ تاریخ وفات اُس رفیع قدر محفل نکتہ دانی کی ہر ایک سخن سنج نے کہی ہے، لیکن یہ تاریخ اُس فرہادِ بے ستونِ مضمون تراشی کے سنگِ مزار پر کندہ کی ہوئی ہے +

خلد کو جب حضرتِ سودا گئے
فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دور کر یاے عناد
شاعران ہند کا سر مد گیا

آغا باقر کا امام باڑہ اس محبِ امام علیہ السلام کا مدفن ہے، سایۂ قدومِ امام کے باعث

اس گلشن ہستی کی عجب دید ہے لیکن		جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو		مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا
جگہ تھی دل کو ترے دل میں اک زمانہ تھا	وله	مرے بھی شیشہ کو اس سنگ میں ٹھکانا تھا
جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا	وله	ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤں گا
لطف ای اشک کہ جوں شمع گلا جاتا ہوں		رحم ای آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا
چھیڑ مت باد بہاری کہیں جوں نکہت گل		پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

۲ - سوز

سوز تخلص، سید میر نام، ساکن قراول پورہ شاہ جہان آباد۔ سید علی نسب، اور فن سخنوری میں اُستاد، طرز ادا بندی کے بادشاہ، اور صحت مضمون درد آمد تھے۔ کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے، اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز۔ شعر کے پڑھنے میں صاحب طرز خاص تھے، اور آئین محبت میں مایۂ مودت و اخلاص۔ علم تیر اندازی اور کمان داری میں بہ شدت دل آشنا رکھتے تھے، اور حسن شفیعہ نویسی میں نہایت دستِ رسا۔ ابتدائے جوانی میں انہوں نے ساتھ کامِ دل کے ایام زندگانی کو صرفِ نشۂ بے خمار کیا، اور سنہ اٹھارویں میں جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے وارستہ مزاجی کی تکلیف سے لباسِ فقر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے، اور اوقات ساتھ توکل و قناعت کے بسر کرتے تھے۔

سنہ ۱۲۱۲ بارہ سو بارہ ہجری میں مرشد آباد تک تشریف لائے، لیکن اطوار سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے۔ اُسی سال پھر لکھنؤ تشریف لے گئے، اور اس دارِ فنا سے راہی ملک بقا کے ہوئے۔

علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ جس سال یہ تذکرہ میں لکھتا ہوں، تو میر مذکور نے کچھ اشعار اپنے مع چند فقرہ نثر لکھ کر مجھے بھجوائے تا کہ داخل تذکرہ کروں" چنانچہ ایک

آدہ فقرہ میر مذکور کی نثر کا بھی خانِ مذکور نے تذکرے میں لکھا ہے۔ ترجمہ اُس کا زبانِ ریختہ میں راقم حقیر نے اس طرح کیا ہے کہ جو شے حق سبحانہ تعالیٰ نے خلق کیا ہے، بلکہ جتنے خار و خس ہیں، کتنے ہی کام آتے ہیں، اور بندگانِ خدا اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر یہ سوز وہ شخص ہے کہ کسی کو اس سے حلاوت حاصل نہیں ہوتی ہے، سوا سکوت اور کراہیت کے۔ سبحان اللہ! یہ بھی قدرتِ الٰہی کا اظہارِ کمال ہے، کہ ایسی شے خلق کی جاوے۔ جس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھاوے پس اگر کوئی منکر سوال کرے کہ ناکارہ محض تو نہیں ہے؟ خیر تو اس لائق ہے کہ نام اُس کا قابل جلانے کے ہے۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان ہیں۔ اشعار منتخب ان کے لکھے جاتے یہاں ہیں •

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

درد سے محروم ہوں وریاں سی مجھ کو کام کیا
یارِ خاطر تھا سو میرا بارِ خاطر ہو گیا

میں نے جانا تھا صحیفہ عشق کا ہے میرے نام
واہ یہ دیوان بھی نقلِ دفاتر ہو گیا

کیا مسیحائی ہے تیرے لعل لب میں اے صنم
بات کے کہتے ہی دیکھو سوز شاعر ہو گیا

وله

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دُکھ جائیگا
ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا پائے گا

قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے
پہ مجھے تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

پھر بھی کہتا ہوں تجھے آ سوز کو یوں مت ستا
مت ستا ظالم! کہیں تو بھی ستایا جائیگا

وله

مُندی گر چشم ظاہر دیدۂ بیدار ہو پیدا
در و دیوار سے شکلِ جمالِ یار ہو پیدا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا

یہاں تک کفر پورا چاہئے گر خاک گلشن ہو
بجائے ہر رگِ گل رشتۂ زنار ہو پیدا

قتیلِ خنجرِ مژگاں ہوں، کیا یہ بھی تعجب ہے
کہ میری خاک سے سبزے کی جا گر خار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو ڈر ہے
جو لاکھوں بار ہو وے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

وله

جی تاک میں آیا بتِ گلفام نہ آیا
جیتا تو الٰہی مرے کچھ کام نہ آیا

دنیا میں یہی دوستی ہوتی ہے مری جان
جبتک نہ لیا دل تجھے آرام نہ آیا

عالم کی تمنا میں تھی جاں لب آیا
قاصد تو پوچھا تھا کہ قاصد ہے تو کس کا
تھا نزع کی حالت میں یہی سوز کی لب پر
رحمت سے خدا کی تو لب بام نہ آیا
وحشت سے اُسے یاد مرا نام نہ آیا
جی ناک میں آیا، بُت گل فام نہ آیا

کھڑے رہیو والو مگر سوز ہے یہ
مرا کشتہ ایسا تو ہے جس کی خاطر
وله
بھلا اس کے دل کا تو ارمان نکلا
یہ خورشید پھاڑے گریبان نکلا

قتل سے یہ بے گنہ راضی ہے اپنے اس لئے
وله
ہاتھ میں اک روز تو داماں قاتل ہووے گا
ابر کے قطرہ سے ہو جاتے ہیں موتی ناصحا
کیا ہمیں رونے سے اپنے کچھ نہ حاصل ہووے گا
دھل گئے گر اس خوں سے آخر پھر تجھے آویگا رحم
سوز کا دل جس گھڑی خنجر سے بسمل ہووے گا

کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا
زلفوں سے پڑا طول میں اب عشق کا جھگڑا
وله
جو تم سے بتاں ہو گا سو اللہ کرے گا
خط آن کے یہ مجملہ کوتاہ کرے گا

اپنے رونے سے گر اثر ہوتا
وله
قطرۂ اشک بھی گہر ہوتا
جن کے نامے پہنچتے ہیں تجھ تک
کاش میں اُن کا نامہ بر ہوتا
پھر نہ کرتا ستم کسی پہ اگر
حال میرے سے باخبر ہوتا
خون عشاق کرتے کیوں ناحق
گر بتوں کو خدا کا ڈر ہوتا
سوز کو شوق کعبہ جانیکا
ہے بہت پر زیادہ تر ہوتا

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا
وله
تو محشر تک نہ لیتا نام ہر گز آشنائی کا
نہ پہنچے آہ و نالہ گوش تک اُس کے کبھو اپنا
بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا
خدایا کس کے ہم بندے کہا دیں سخت مشکل ہے
رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعویٰ خدائی کا
خدا کی بندگی کا سوز ہے دعویٰ تو خلقت کو
ولے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خودنمائی کا

قاضی ہزار طرح کے قصوں میں آسکا
قاصد ہو طفل اشک گئے بارہا ولے
وله
لیکن نہ حسن و عشق کا جھگڑا چکا سکا
دل کی خبر کوئی نہ تری کو سے لا سکا

کیا فائدہ ہی رونے سے اے چشم زار بس		کب اشک دل کی آگ لگی کو بجھا سکا
رستم نے کوہ پہاڑ اُٹھایا تو کیا ہوا		اُس کو سراہیئے جو ترا ناز اُٹھا سکا
اے سوز عزم کوچۂ قاتل نہ کر عبث		تو ایک بھی بتا دے کہ واں جاکے آسکا
خطرہ نہیں ہی مجھ کو اے عشق اپنے جی کا	ولہ	تونے خطاب بخشا جب سے بہادری کا
ہر صبح منہ چڑھے ہی اُس تندخو کے اُٹھ کر		کیا آہنی کلیجہ دیکھے ہے آرسی کا
کہتا نہ تھا میں اے دل اِس کام سی تو باز		دیکھا مزا نہ تونے نادان عاشقی کا
عارض کو تیرے پہنچے کب اُس کی ٹھہٹہاہٹ		پیارے ہزار ہو تو ہے گل کا رنگ پھیکا
رستم تو آج تو ہے میدان کے سخن کا		اے سوز کس کو دعویٰ ہی تجھ سے ہمسری کا
تجھ پہ قربان مری جان دل و دیں میرا	ولہ	ایک باری تو سُن افسانۂ رنگیں میرا
بوسۂ گل شاخ ہوا میں سی بھی لیتا ہی چمن		کس قدر شوخ ہے اللہ یہ گلچیں میرا
زلفوں کا اگر مجھ کو سروکار نہ ہوتا	ولہ	یہاں تک تو پریشان یہ دل زار نہ ہوتا
خوگر جو مداوے سے طبیب اپنے کو پاتا		تو زیست سے مایوس یہ بیمار نہ ہوتا
گر آنکھ اٹکتی نہ کسی شوخ سے جاکر		تو دل بھی کہیں سوز گرفتار نہ ہوتا
ایک دن اک شخص نے اُس سی کہا	ط	تونے تو یہ ذکر سُنا ہوئے گا
یعنی کہ عاشق ہے ترا بھی سی سوز		ہو متبسم یہ کہا ہوئے گا
بلبل نے جس کا جلوہ جاکر چمن میں دیکھا	ولہ	دو آنکھ موند ہم وہ نے من ہی من میں دیکھا
خورشید آوے جیسے ابر تنک کے اندر		عاشق کو تیرے جن نے یوں پیرہن میں دیکھا
یوں دیکھنے سے تیرے کیا فائدہ کسی کو		دیکھا اُنہیں نے تجھ کو جن نے سخن میں دیکھا
اس سوا کچھ نہ پایا تیرے دیوانے کا	ولہ	قطرۂ خوں ہے مگر خار بیاباں میں لگا
کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا	ولہ	مرے سوال کا منہ سے جواب نکلے گا
نکلنے کا نہیں سینے سے دل جو ڈھونڈے گا		جو نکلے گا تو جلا سا کباب نکلے گا

ولہ ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا
رہے گا مر گئے کے بعد از مزار میں رونا

جو چھپ کے رات کو شبنم چمن میں روئے تو کیا
مجھے تو ایک سے لے تا ہزار میں رونا

نہ غم خزاں کا مجھے نے بہار کی شادی
خزاں میں خاک ہے سر پہ بہار میں رونا

تو روز وصل تو اے سوز اپنے آنسو پونچھ
ابھی بہت ہے تجھے ہجر یار میں رونا

ولہ بتوں کے عشق سے واللہ کچھ حاصل نہیں ہوتا
اُنہوں سے بات کرنے کو بھی اب تو دل نہیں ہوتا

ولہ جس نے تہم کے تئیں دم بخشا
اُس نے مجھ کو دل پُر غم بخشا

ساغر عیش دیا اوروں کو
سوز کو دیدۂ پُر نم بخشا

ولہ جس نے ہر درد کو درماں بخشا
مجھ سے کافر کو بھی ایماں بخشا

بے نیازی تو میاں کی دیکھو
گل کو بھی چاک گریباں بخشا

چشم معشوق کو دی عیاری
سوز کو دیدۂ گریاں بخشا

ولہ غم تو کہتا ہے کہ میں تجھ کو ستا جاؤں گا
پر مری جان ترے غم کو میں کھا جاؤں گا

ہم غریبوں کے گھر آنے کا کہاں تم کو دماغ
مت کرو وعدہ عبث ہم سے کہ آ جاؤں گا

اس طرح جی دوں کہ تو رحم سے بولے صد حیف
رسم عشاق کشی جان اُٹھا جاؤں گا

باغباں فکر نہ کر تو مرے ویرانے کا
آشیاں آتش گل سے میں جلا جاؤں گا

لے چکا دل کو خطاب جان جو مانگی ہی غزل
سوز کہتا ہے یہ گولی تو بچا جاؤں گا

ولہ گل ہی نہیں غلام تبسم کی آن کا
غنچہ بھی زر خرید ہے تیرے دہان کا

زاہد جو کھینچ کھینچ کے چلے ہوا ہے خم
بہتر ہے ایسے چلوں سے چلہ کمان کا

سینہ میں دل کہاں ہے غم رنجگاں سے سوز
اخگر یہ رہ گیا ہے نشاں کلدان کا

ولہ جو دل کہ تھا الٰہی اُس دلربا کے گھر سا
خالی پڑا ہے اب یوں اُجڑا ہوا نگر سا

ترسا نے ترس کھایا احوال سن کے میرا
بے ترس ڈھونڈا ہے اتنا نہ مجھ کو ترسا

شاید کہ اپنے گھر کی دی اُس نے خاک روبی
خورشید کی کلہ پہ کچھ تو دھرا ہے پرسا

جاتا ہی سوز جس دن کہتا ہی ہمنشیں سے
آئے نہ دیکھو اس کو لگتا ہے بد نظر سا

ولہ
مروت وشمنا غفلت پناہا
ادھر ٹک دیکھ لیجو مرتے کے آہا
صَرَفْتُ العُمرَ فِی لَھوٍ وَلَعِبٍ
فَآھًا ثُمَّ آھًا ثُمَّ آھًا

یوں دیکھ لے ہی وہ کہ ادا کو نہ ہو خبر
چھینے دل اس طرح کہ دغا کو نہ ہو خبر
عشاق تیری تیغ تلے او ستم پناہ
سر اس طرح سے دیں کہ قضا کو نہ ہو خبر
رخصت جو دی تو مجھ کو تو میں تیرے پاؤں کا
بوسہ لوں اس طرح کہ حنا کو نہ ہو خبر
ناصح تو چاک جیب کا مانع ہی اس قدر
دل چاک یوں کروں کہ قبا کو نہ ہو خبر

ولہ
اب ضرر کرنے لگا دل کو بتاں کا اختلاط
سچ تو ہے ان بے وفاؤں سی کہاں کا اختلاط
اب کوئی دم کو مچاوے گی خزاں یاں آ کے دھوم
عندلیبو چھوڑ دو تم گلستاں کا اختلاط

ولہ
یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا
نہ دیکھوں جب تلک آنکھوں سی کچھ باور نہیں آتا
پرائے دل کو لے کر اپنے تلوؤں کے تلے ملنا
ارے سن تو تجھے ہرگز خدا کا ڈر نہیں آتا
کسی کے دل میں ہوگا سوز مر جاوی تو بہتر ہے
الٰہی میں مروں کیوں کر مجھی تو مر نہیں آتا

ولہ
کیا دید کروں میں اس جہاں کا
وابستہ ہوں چشم خوں چکاں کا
ہرگز نہ ملا تری گلی سے
ممنون ہوں جسم ناتواں کا
سوز آگے ذرا سنبھل کے جانا
بیٹھا ہے لگائے گھات بانکا

ولہ
جگر سی آہ دل سی نالہ سینہ سے فغاں نکلا
سرا تن سی کیا حسرت زدوں کا کارواں نکلا
جو دل تھا میرے پہلو میں سو اب عرش اعظم ہی
خدا کے واسطے دیکھو کہاں سی جا کہاں نکلا

ولہ
الٰہی محبت کو لگ جائے لوکا
کہ اٹھتا ہے ہر دم جگر سے بھبوکا
فریب محبت نے مجھ کو پھنسایا
میں بھولا میں بھولا میں چوکا میں چوکا
جہاں روز پریوں کا رہتا اکھاڑا
وہاں اب پڑا ہے گا میدان ہو کا

ولہ
مرا قتل کیا دل ربا تے نہ چاہا
وہ کب چوکتا تھا خدا نے نہ چاہا

چشم غفلت کھول کر ٹک دیکھ تو اے مست خواب
دہر نے کن کن ملوکوں کا کیا خانہ خراب
مسند فرعونیت پہ بیٹھتے تھے جو بہ ناز تو
اہل استحقاق کا منہ سے نہ دیتے تھے جواب
خاک میں پنہاں ہوئے ایسے کہ کچھ پیدا نہیں
کون سا ان میں ہے رستم کون سا افراسیاب
بارہ ساعت کے لئے افلاک پر ہیں جو داغ
واہ واہ ان کو بھی کہو آفتاب اور ماہتاب
پوچھیو تو باندھ کر کس پہ چلا ہے تو کمر
میں پڑا کھاتا رہوں گا تا قیامت پیچ و تاب
ان دنوں میں سوز کو دیکھا ہے یارو واہ وا
ایک دنیا دار سے مل کر ہے عالی جناب

ولہ

اشک کب ہوں تیرے رستانے کی خشک
اوچھے کب ہوتے ہیں منجانے کے خشک
چوری چوری منہ ترے شاید لگا
ہونٹ کچھ بے ڈھب ہیں پیلنے کی خشک
زلف کی پلٹوں میں کیا جا کر چھپا
یا الٰہی ہاتھ ہوں شانے کے خشک

ولہ

ٹکرائیں سنگ سے سر ہو ہمکنار ہم تم
روئیں گلے سے لگ کر اے آبشار ہم تم
میرا ہی سرو مجھ سے سرکش ہوا ہے قمری
نالے کریں نہ یک جا ہیں سوگوار ہم تم
دیکھیں تو داغ سینہ کس کے ہیں اب زیادہ
اے لالہ داغ دل کے کریں شمار ہم تم
تو میری دل کو دیکھ اور میں تیری دل کو دیکھوں
دل چاک چاک کر کر دیکھیں بہار ہم تم
تم تو چلے گئے پر یہ سوز ہے اکیلا
اے میر درد صاحب تھے یادگار ہم تم

۳- سجاد

سجاد تخلص ہے میر سجاد نام اکبر آبادی۔ وطن بزرگوں کا انکے آذربایجان ہے، لیکن تربیت انہوں نے شاہ جہان آباد میں پائی ہے۔ اور شاگردوں میں شاہ نجم الدین آبرو کے کیفیت طرز ایہام شاہ صاحب مذکور سے زیادہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی وضع کا یہ عزیز بھی اُستاد ہے میر محمد اکرم خاں دادا ان کے دارالانشائے بادشاہی میں نواب یحیٰی خاں میر منشی کے ہمراہ تھے، بہت مرد سنجیدہ اور حقیقت آگاہ تھے۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان پُر بیان ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب دیوان ہیں؀

ساقی بغیر جام کے جی کا بچاؤ نیں — جوں فیل مست آئے ہے ابر سیہ بلا

وله

کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یہاں کوئی — مرجا ستم سے اُن کے تو کہتے ہیں حق ہوا

گر تیرے گل کے آنے نے کھو ہی نہیں حواس — سجاد کیوں پھرے ہے بجن آج فق ہوا

وله

یعقوب کے جب عشق پڑا سر پہ ٹوٹ کے — آنکھوں نے اُس کی رو دیا آخر کو پھوٹ کر

عشق میں جائے گا بے طرح مارا — بے طرح دل ہوا ہے آوارا

خط کترواکے آج قینچی سے — ہم سے ملنے میں جائے ہے کترا

غم نہیں گر گم ہوا بالوں میں تیری جا کے دل — پیچ پر تجھ زلف کے گویا کہ اُس کو بل دیا

تجھ کو اے سجاد غیر از خنجر بیداد کے — اور بھی کچھ ظالموں کی دوستی نے پھل دیا

بتان تو چاہتے سجاد تجھ کو — کریں کیا پر خدا نے جو نہ چاہا

مقبول اس جہاں کا ہرگز کسی نہ دیکھا — راجہ وہی ہے جو کوئی یہاں سے گیا ہی ناچ

وله

شتابی پلا دے کہ جاتا ہے ابر — جو کچھ باقی ساقی رہی ہو شراب

وله

دور میں رخسار کے تیرے کہیں انصاف نہیں — خط چرا لے جائے دل کو اور باندھے جائے زلف

وله

جس خوبرو کے دل میں نہ عاشق سے ہو نفاق — کہتے ہیں ساری اُس کے تئیں حسن اتفاق

وله

ایک دل رکھتا ہوں جو چاہے سو لیجا دو اُسے — خواہ زلفیں خواہ مژگاں خواہ ابرو خواہ چشم

وله

جب ہم آغوش یار ہوتے ہیں — سب مزے در کنار ہوتے ہیں

وله

بتوں کے تئیں کس قدر مانتا ہے — یہ کافر مرا دل خدا جانتا ہے

اے صنم زنار پہنی تجھ وفا کے واسطے — ورنہ کوئی کافر بھی ہوتا ہے خدا کیواسطے

وله

کوئی جا کے قاتل کو سمجھائیے گا — کہ عاشق کا جی کھو کے کیا پائیے گا

کہا دل نے بولو یہ خوبوں کے تئیں — یہ دیکھو گے اپنا کیا پائیے گا

وله

میرے تمام حال کی تقریر ہے یہ زلف — روز سیاہ و نالۂ شبگیر ہے یہ زلف

وله

رہو آہ دل سوز میرے سے فرق — کہ ہے خوشہ میں اس کے خرمن کی برق

دل کو کبھی پیار دلا کر کے اے سجن — لاگا نہیں گلے سے مرے آج لگ

ولہ

لخت جگر ہمارا پاؤں کے ساتھ کھا کر — کرتے ہو ہم سے باتیں اب تم چبا چبا کر

باب الشین

۱- شورش

شورش تخلص، میر غلام حسین نام متوطن عظیم آباد کے مشہور میر پھینا کر کے تھے۔ بھانجے تھے ملا میر وحید کے۔ اور مشورہ سخن کا کیا تھا میر باقر حزیں تخلص سے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ میرے آشنا تھے، اور بیماری میں غرور کی مبتلا تھے۔ فقط اپنے خیال فاسد سے انہوں نے اپنے کلام کی قباحتوں پر التفات نہیں کیا ہے، اس سبب سے سخن ان کا ہمیشہ مورد اعتراض سخن گیروں کا رہا ہے"۔ ایک تذکرۂ شعرائے ہند کا زبان ریختہ میں انہوں نے لکھا ہے، لیکن وہ بھی بسبب ان کی خود پسندی کے خالی خلل اور زلل سے نہ تھا۔ سنہ ۱۱۹۵ گیارہ سو پچانوے ہجری میں اس سرائے فنا سے جادہ نورد منزل بقا کے ہوئے۔ دیوان ان کا زبان ریختہ میں مرتب ہے۔ یہ ان کے کلام کا منتخب ہے +

ہمارے پاس بھی آیا نہ آیا — بھروسہ کیا ہے جی آیا نہ آیا

ولہ

کسی کو غم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام — قسم مغاں کی ہے ساقی کو ہم کو نام سے کام
اٹھی یہ الفت گل کے سبب سے سب اپنا — وگرنہ کیا تھا ہمیں ہم صفیر و دام سے کام
ہماری صبح رخ یار شام زلف نگار — نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح شام سے کام
ہر ایک دم میں ہمیں وصل ہجر میں موجود — غرض نہ نامہ سے رکھتے ہیں نے پیام سے کام
رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش — ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام

بابُ الصّاد

۱- صائغ

صائغ تخلص- نظام الدین احمد نام- ساکن بلگرام- علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ تجاہل قدیم سے میرزا محمد رفیع سودا کے، اور دوستانِ صمیم سے اس خاکسار کے تھے۔ بڑے صاحب درد و تاثیر، اور طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر جب کسی سے سُنتے، تو گھڑیوں روتے، اور بے چین رہتے عالم اخلاص اور دوستی میں زمانہ کے افتخار، استقامت طبع اور رسائی ذہن میں مستغنی روزگار تھے- سنہ بائیسویں تک جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد آباد اور کلکتے میں ایام زندگی کے بسر کرتے تھے- آخر سنہ[1] ہجری میں ملک بہ جوہ سے رخت سفر کا باندھ کے راہی کشور عدم کے ہوئے- فارسی دیوان مترتب ہے ان کا- اور ریختہ کا شوق کمتر تھا- یہ اشعار اس نکو کردار کے ہیں ؂

سجن کی اُس محبت پہ دیا تھا جان دل صائغ
نہ تھا معلوم ہو جاوے گا وہ نامہرباں اپنا

ولہ

جلے بجھنے ترے جس وقت آہ کرتے ہیں
تو دود دل سے جہاں کو سیاہ کرتے ہیں
قسم ہے تیری ہی، کھلنے میں یار تیر نگاہ
جگر تلک نہیں دل کے تباہ کرتے ہیں
یہی ہوئے ہیں تب و تاب جاں ستی آگاہ
جو کوئی دل سے گذر گاہ گاہ کرتے ہیں
خدا بچاوے غم و درد و ہجر عشق میں آہ
ڈبا کے زورقِ دل کو تباہ کرتے ہیں
نہ کو مکن سے ہوئی بے ستوں میں صائغ رُ
بڑے وہ مرد ہیں جو دل میں راہ کرتے ہیں

ولہ

ہلاہل شوق سوہن کو دھڑی ہونٹوں جلانے کا
نہ جانوں کیا سبب یاقوت نیلم بنانے کا

[1] قلمی نسخہ میں سن وفات نہیں لکھا

یہ بلبل شاخِ گل پر بیٹھ کر کیا شور کرتی ہے | صبا کا آج وعدہ ہے مگر کلیاں کھلانے کا

باب الضاد

۱- ضیا

ضیا تخلص، میر ضیاء الدین نام، متوطن شاہجہان آباد کے، میرزا محمد رفیع سودا کے ہم عصر، نظم ریختہ میں مالک تھے طبعِ بلند کے، اور صاحب تھے ذہنِ ارجمند کے۔ دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے، تو طرح سکونت کا وہیں ٹھہرائے۔ ایک مدت اوقات اُسی شہر میں بسر کی، اور داد شعر و شاعری کی دی، اکثر سخنوروں کو اس دیار کے نسبت شاگردی کی اُس شاعر شیریں کلام کے ساتھ ہے، اقسام نظم میں ان سے بیشتر ہوئی فکرِ غزلیات سے ہے۔ قصیدے سے تو ان کو کچھ انکار سا رہا ہے، اور مثنوی کا خیال بھی کم تر کیا ہے۔ آخر عمر بلدۂ عظیم آباد میں استقامت اختیار کی تھی اور طبیعت اکثر ساتھ عزلت و گوشہ نشینی کے بار کی تھی۔ آشنا پرست اور دردمند رنج و راحت میں ہمیشہ خورسند تھے۔ از بسکہ مدارِ دنیائے فانی کا فنا پر ہے راہ گذارِ جادۂ بقا کے ہوئے۔ مالک دیوان رنگین و متین کے ہیں۔ یہ شعر اس شاعر ذکی و ذہین کے ہیں ◆

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا | آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کملانے لگا
گل کی رسوائی تجھے کیا بن نہ تھی اے ننگِ خلق | اُس کے کوچے میں ضیا پھر آج تو جانے لگا

ولہ

پلادے آبِ خنجر ہم کو ظالم تشنہ جاتے ہیں | جو کوئی مرتا ہے اُس کے حلق میں پانی چواتے ہیں
ہے ماتم کس دوانے کا الٰہی آج صحرا میں | کہ سیلیں سی پھرتی ہیں بگولے خاک اُڑاتے ہیں
ضیا رکھ ہاتھ سینے پر خبر دل کی بھی ہے ظالم | کہ آج آنسو تری آنکھوں سے کچھ لوہو سے آتے ہیں

ولہ

گریاں و خاک اُڑاتا جوں ابر و جوں بگولا | صحرا میں تو نے مجنوں وحشی ضیا کو دیکھا
اے آہ غنچۂ گل نہ کہیں دل تھلک پڑے | یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

تیرے مینا کا حال میں پوچھا تھا شمع سے
اک آہ اس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک گئے

باب العین

۱۔ عزلت

عزلت تخلص، سید عبدالولی نام۔ خلف شاہ سعید اللہ سورتی کے۔ وہ شاہ سعید اللہ کہ سر دفتر فاضلان اور سر حلقہ صاحبدلان تھے۔ اور بادشاہ عالمگیر کے تئیں اس مرجع خلائق سے اعتقاد صادق تھا۔ اصل وطن شاہ صاحب مذکور کا کوئی قصبہ ہے قصبات لکھنؤ سے، لیکن ازبسکہ اقامت سورت میں اختیار کی تھی سورتی مشہور ہوئے۔ غرض جب عزلت مذکور اپنے والد کی وفات کے بعد دلی میں گئے، تو شاہ جہان آباد کے سخنوروں کی ہم صحبتی سے فکر میں ریختہ کے پڑے تلاش پر نظم کی دل دیا، اور حوصلہ شعر و شاعری کا حاصل کیا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ با وصف تمکنت و فضیلت کے اوضاع و اطوار اس عزیز کے خالی سبکی اور بے مغزی سے نہ تھے۔ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ مغفور کے عہد دولت میں وارد مرشد آباد کے ہوئے، اور مورد عنایت و امداد کے ہوئے۔ حرکات ان سے خلاف ان کے منصب کے عمل میں آتے تھے اور آنکھوں میں ارباب تمیز کی کیفیت کو اعتبار کی گھٹاتے تھے۔ نواب مرقوم الصدر کی وفات کے بعد سرزمین دکن نور جمال سے اپنے منور کی، اور بقایائے عمر اسی مملکت میں بسر کی۔ دیوان ان کا مدت سے پاچکا انتظام ہے، یہ ان کا منتخب کلام ہے۔

ضمیروں سے نہ ہو نیرنگ لالن فصل ہولی میں
بہار آئی چمن میں غل ہے بلبل کی صفیروں کا

ولہ

ترا جامہ گلابی ہو تو میرا خرقہ بھگووں ہے
جبا سے ہر گلی میں شور زنجیر اسیروں کا

محبت نے تمہارا دل ناز سکھلانے کے کام آتا
یہ آئینہ تھا، اس خود بیں کے استغنا کے کام آتا

جلایا صحفِ دل تو نے کیوں برقِ تغافل سے
جو سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانے کے کام آتا

بتوں کا جور دیوانہ دوا کرتا نہیں گا ولہ کہ پتھروں کو وہ صندل دردِ سر کا جانتا ہیں گا
بگولا بن کے ساوے دستوں میں کوہ کن تب تب نسیم گلگوں کی مانی ٹہاتھ مل مل چھانتا ہیں گا
سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا سمجھیں اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہیں گا
مجھے چاہے کہ پتھر مارے سب دشنام سکیں گا غلیل ابر کے خزالت کس مزہ سے تانتا ہیں گا
ہوا ہے داغ اس کا مغز نازک آتش گل سے ولہ چمن زادوں میں اک مزاحمش لالہ ہوا پیدا

جدھر نکلے وہ ہولی بنا کر ولہ گلابی ہے غبار راہ وہاں کا
تحمل امید بیوفایوں سے طہ دل سلامت رہے تو پھل پاتا
اول میں عشق اپنے سے بیہوش کیا ولہ یاد اپنی دی پھر ہم کو فراموش کیا
ہم سے بھی جرس وار ای یار سفری دل کو نالاں لبوں کو خاموش کیا

ہماری گرد سے دامن جھٹک گیا دلدار ولہ کلال سا پڑا جلتا ہے اب تلک یہ غبار
یاروں کی خاطروں کی کیا دل مرا خبر لے ولہ ہیں پر غبار سب دل کیا خاک جا خبر لے
یوں شب کہ صبح ہو جائے تب آفتاب آ کے ہم جل کے ہو گئے راکھ جب لگ وہ آ خبر لے
ہم ہیں مفلس یار کی قیمت گراں کیا کیجئے ولہ ہم زمین اور اس کا رتبہ آسماں کیا کیجئے
بچا دل زلف کے عقرب سے تو کیا ولہ کہ چوٹی ناگنی پیچھے پڑی ہے
تری زلف کی شب کا بیدار میں ہوں ولہ تجھ آنکھوں کے ساغر کا مخمور میں ہوں
کدھر بہتا پھرتا ہے اے گریۂ غم کہ آنکھوں سے تیرا خریدار میں ہوں
پیر ہویا شیخ ہو سے دیکھو طفلاں کا مرید ولہ مردہ بولا ہے کفن پھاڑ قیامت آئی
دل میں رندوں کے پھپھولا ہوا عمامۂ شیخ ولہ یارب اس بزم سے یہ زہر کا گھڑا اٹھ جاوے
کھلا کے دل جسے پالا سو ہے مراد الی ولہ جناب پاک جنوں مد ظلہ العالی
شانہ اس زلف میں پھرتے یہ سخن کہتا تھا ولہ بات کہتے ہی شب وصل چلی جاتی ہے
شکستہ گر ہوا دل اب نظر نہ کر مجھ کر یہ ٹوٹے آئینے میں منہ تری بلا دیکھے

۲- عشق

عشق تخلص، شاہ رکن الدین نام۔ شاہ گھسیٹا کر کے مشہور تھے۔ شاہجہاں آبادی۔ نواسے شاہ فرہاد کے عمدہ مشایخوں میں سے دلی کے۔ جہاں بیان ہوتی۔ شاہ فرہاد کی حالت سکر و مستی ہے، تو کہتے ہیں کہ اس عالم میں تعظیم بادشاہ کی نہیں کی ہے۔ غرض عشق مذکور ایام شباب میں شاہجہان آباد سے مرشد آباد میں آئے، اور خواجہ محمدی خاں مرحوم کے ساتھ لباس دنیا داری میں ایک مدت ایام حیات بعزت تمام بسر ہوئے۔ اگرچہ نہ کچھ خدمت نہ کام رکھتے تھے۔ لیکن آنکھوں میں امرایان مرشد آباد کے نہایت احترام رکھتے تھے۔ بعد ایک عرصہ کے اپنے بزرگوں کے طور پر مزاج فقر و درویشی کی طرف آیا، اور تکیہ فضل ایزدی پر کر کے طور استقامت کا عظیم آباد میں ٹھہرایا۔ پھر تو نہایت زور و شور کے ساتھ مشیخت پناہی کی، اور معتقدوں کے ہجوم سے عالم درویشی میں شاہی کی۔ طالبان راہ عشق کو ہدایت مطلب سے خالی نہیں چھوڑا۔ بقول علی ابراہیم خاں مرحوم ۱۱۹۰ سنہ گیارہ سو نوّے ہجری تک داد حال و قال کی دی۔ آخر بلدۂ عظیم آباد میں مرشد حقیقی قضا کے ارشاد دعوت پر لبیک اجابت بآواز بلند کہی۔ دیوان اس مشیخت دستگاہ کا زبان ریختہ میں متعارف ہے، یہ اس کا منتخب ہے۔

کہنے کو اِدھر اُدھر گئے ہم — تھے تیری طرف جدھر گئے ہم
تا جاں نہ ہوئی صدو دل حسکی — تو نے کہا مر، تو مر گئے ہم

بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں — وله — عشق رخصت دے تو شورِ حشر آب برپا کروں
سنے صدِ دل ہے باقی نے آہ و نے فغاں ہے — وله — اے سوز عشق سچ کہ تو ان دونوں کہاں ہے
دیکھنے بن اُس کے یک دم چین یہ رہتا نہیں — وله — اس دل کافر کے ہاتھوں سخت گھبرائے ہیں ہم
جوں آفتاب تاباں گو نام کو عیاں ہوں — وله — یہ پرتو ہے تیرا کہو دیکھیں میں کہاں ہوں
گو نام اور نشاں سے ہے ظاہر میں میرا یارو — جو دیکھو فی الحقیقت ہوں وہم یا گماں ہوں
باتیں نہ سن تو میری جل جائے گا دِوانے — میں برق آسماں ہوں یا عشق کی زباں ہوں

عرش تا فرش سیر کر دیکھا | توہی آیا نظر جدھر دیکھا
چشمِ تحقیق سے جہاں ڈھونڈھا | کافر ہوں تجھ سوا اگر دیکھا
تیرے کے نام پر تڑپتا ہوں | اس طرح کا کہیں جگر دیکھا
آبلہ آبلہ ہوئے سب عضو | نخلِ الفت میں یہ ثمر دیکھا
سحر میں سامری کے کیا قدرت | تیری نظروں میں جو اثر دیکھا
اپنے ہم چشم سے لگا کہنے | نالہ و آہ گھر بہ گھر دیکھا
ٹک اک انصاف سے اگر دیکھو | عشق سا کوئی چشم تر دیکھا

وله

دیدۂ دل جو کر کے وا دیکھا | حرم و دیر میں خدا دیکھا
ہنس کے کہنے لگا ملامت گر | عشق میں تو نے کیا مزا دیکھا
اس کی لذت کو دل سمجھتا ہے | اس کو میں کیا کہوں کہ کیا دیکھا
دشت تجھ کو قسم ہے مجنوں کی | عشق سا کوئی رہنما دیکھا

وله

از عدم تا وجود آ دیکھا | جان دیکھا سو بے وفا دیکھا
اپنی آنکھوں سے دیکھ اے خوش چشم | مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا
تجھ سے کوئی آشنا نہ ہوا ہو | پر تجھے سب سے آشنا دیکھا
اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم | خاک میں آپ کو ملا دیکھا
ظالم اپنی جفائیں کہ تو کبھو | لب مرا شکوہ میں ہلا دیکھا
کبھو غم سے جدا نہ دیکھا میں | عشق کو جا کے بارہا دیکھا

وله

میں کافر ہوں اگر منظور ہووے لطف مرہم کا | کہ یہ داغ جگر ہے یادگار اس یار ہمدم کا
ترا یہ وعدۂ فردا تو دل کو روز فردا ہے | کہاں فرصت ہے اے ناداں بھروسا ہی کہاں دم کا
رلاتے میں مرے کچھ تجھ کو ہوئیگا فائدہ کہ تو | مگر اتنا کہ گھر اپنا ڈبویا اور مردم کا
کفایت ہے بروزِ حشر مجھ کو شفقتِ حیدر | کہ جس کے نام سے زہرا ہوا پانی جہنم کا

چاکِ دل تا بہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا بے وفائی تری دل دیکھ کے اے دھوکہ خلاف	دل	لختِ دل زینت داماں نہ ہوا تھا سو ہوا عشق بازی میں پشیماں نہ ہوا تھا سو ہوا

۳۔ عیش

عیش تخلص، میرزا عسکری نام، بیٹے مرزا علی نقی کے۔ وہ مرزا علی نقی جن کو نواب حسین قلی خاں کی طرف سے اپنی جاگیر کی ایک مدت رہی، اور زندگی اُنھوں نے اس خدمت میں نہایت تشخیص و حکومت کے ساتھ بسر کی ہے۔ غرض میرزا عسکری مذکور جوان مودب باشعور اور تہذیب اخلاق سے معمور ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ میرے آشنا ہیں، بہت ہی باشرم و باحیا ہیں۔ وطن تو ان کا شاہ جہان آباد ہے، لیکن ایک مدّت سے مرشد آباد میں آکر رہے تھے، اور بعضے خدمتوں کے ساتھ سرکار میں ناظم بنگالہ کے اوقات بسر کرتے تھے۔ دیوان ان کا موردِ اشتہار ہے، یہ اُن کا خلاصۂ افکار ہے +

وہ اگر آوے سرِ بام کہیں	میں بھی کرلوں اُسے سلام کہیں
کیا ہے یہ قطرہ قطرہ، دے ساقی	ایک باری تو بھر کے جام کہیں
اس شبِ وصل کی سحر اے چرخ	لیو مت مجھ سے انتقام کہیں
یہ غزل عیش سے ہے تصدق سوز	مجھ سے ہوتی تھی انصرام کہیں

بابُ الفاء

۱۔ فقیر

فقیر تخلص، میر شمس الدین نام، متوطن شاہ جہان آباد کے۔ اُستادوں میں سے شعرائے ہندوستان کے تھے۔ اہل ہند میں مجال کسی کی نہ ہوئی کہ سخن گستری میں مقام فیضی کے ہاں وہ خوش بیانی میں جگہ پر ان کے تکیہ کرسکے۔ دارالخلافہ شاہ جہان آباد میں ہر روز زندگانی کا انھوں نے

نہایت غربت اور استغنا کے ساتھ بسر کیا ہے، اور اس عرصہ میں دکن کا بھی سفر کیا ہے۔ چنانچہ بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔ اقسام نظم میں کوئی قسم نہیں رہی کہ ان کے خامہ سحر آفرین نے اُس میں جادو کاری نہیں کی، اور انواع شعر میں کوئی نوع نہیں چھوٹی کہ ان کے کلک گوہر سلک سے اُس میں دُرباری نہیں ہوئی۔ اکثر علوم میں کتابیں انکی تصانیف سے ہیں۔ خصوصاً عروض و قوافی میں کیا خوب رسالے تالیف کئے ہیں۔ سنہ ۱۱۱۷ھ گیارہ سو سترہ ہجری میں واسطے حج و زیارت کے تشریف لے گئے، بعد حصول سعادتِ زیارت کے جب کہ پھرے تو کشتیِ حیات اُس آشنائے بحرِ معنی کے گرداب ممات میں تباہی ہو کر ڈوبی یعنی اس ناخدائے جہاز سخندانی کے جہاز کو بادِ مخالف نے صدمۂ طوفان دیا، اور دریائے سقطرہ میں غریق بحر رحمت کیا۔ اگرچہ کہنا ریختہ کا اُس اہل کمال کا دون مرتبہ کمال تھا، لیکن اکثر واسطے تفنن طبیعت کے اس کا بھی اشتغال تھا۔ یہ گوہر آبدار اس بحر سخن سنجی کے آویزۂ گوش روزگار ہیں

درد مندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے ۔۔۔ تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے
بے غرض دیدے یاں کام تکلف سے نہیں ۔۔۔ خواہ ادھر بیٹھ گئے خواہ اُدھر بیٹھ گئے
دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے ۔۔۔ لاکھ دیوار گرے سیکڑوں گھر بیٹھ گئے
کس نظر نا نے اُس باز کو بخشی پرواز ۔۔۔ سیکڑوں مرغ ہوا پھاندھ[1] کے پر بیٹھ گئے
کم ہے آواز ترے کوچہ کے باشندوں کی ۔۔۔ نالہ کرتے سے گلے اُن کے مگر بیٹھ گئے
مفت اُٹھنے کے نہیں یار کے کوچہ سے فقیر ۔۔۔ جب کہ بستر کو جما کھول کمر بیٹھ گئے

ولہ

آہ تو نے تو کئی بار ہلایا ہے فلک ۔۔۔ زیادہ گستاخ نہ ہو عرش کو پہنچے گی دھمک
کل ہی کی شب کا ہے مذکور کہ جبریل آئے ۔۔۔ خوب معلوم نہیں آپ تھا یا اور ملک

[1] آج کل باندھ بولتے ہیں ۔

۲ - فغاں

فغاں تخلص، اشرف علی خاں نام تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ خلف میرزا علی خاں نکتہ کے، ہاتھ پیراں کو خوش طبعی اور خوش اختلاطی سے کام تھا۔ کوکے تھے احمد شاہ بادشاہ کے، اور مربی گری سے فراغت کی ندیم تھے جہاں پناہ کے۔ چنانچہ ظریف الملک کوکے خاں بہادر حضور سے بادشاہ کے خطاب پایا تھا اور مرتبہ کو شوخی کے ساتھ لطیفہ سنجی کے بہت دور پہنچایا تھا۔ دِلّی سے مرشدآباد میں اپنے چچا کے پاس، کہ محمد ایرج خاں کر کے مشہور تھے، وارد ہوئے۔ لیکن نہ رہے، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر شاہ جہان آباد چلے گئے۔ بعد کئی برس کے عظیم آباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہاں ٹھہرائے رفاقت میں مہاراجہ شتاب رائے کے چند مدت اوقات کاٹے، اور لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ہی میں دن رات کاٹے۔ اتفاقِ اصلاحِ سخن ان کو شیخ علی قلی ندیم تخلص سے ہوا ہے۔ نظم ریختہ میں طبیعت ان کی رسا ہے۔ سنہ ۱۱۸٦ گیارہ سو چھیاسی ہجری میں اس حباب کو دریائے فنا کے نزاعِ شمار سمجھ کر آشنا بحرِ بےکنار بقا کے ہوئے۔ بلدۂ عظیم آباد اس شیریں کلام کا مدفن ہے، اور تلخی روزِ حشر تک اب وہیں مسکن ہے۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، غزلیں منتخب ان کے دیوان کی لکھی گئی یہاں ہیں +

شکوہ کرے ہے تو جو مرے اشک سرخ کا — تیری کسب ہتیں مری لوہو سے بھر گئی

وله
ہستی کے غنچے نظر آتے جو عدم میں — ہرگز کوئی اس خواب سے بیدار نہ ہوتا
اے شیخ اگر کفر سے اسلام جدا ہے — پس چاہیے تسبیح میں زنار نہ ہوتا

وله
مجھے تو تعزیہ دار اپنا کر گئے اپنے — کہ جو شفیق تھے وہ دوست مر گئے اپنے
عبث تو تڑپے ہے کنج قفس میں مرغِ چمن — اسی تڑپ میں تو یہ بال و پر گئے اپنے
مرا مقام ہے اس سرزمیں پہ عاریتاً — ادھر کو جانا ہے آخر جدھر گئے اپنے
کسے تو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اے فغاں تنہا — کہ اس سفر کے مسافر تو گھر گئے اپنے

وله
شب فراق نہ تنہا مجھے رلاتی ہے — یہ صبح وصل بھی آنسو سے منہ دھلاتی ہے

اگر میری زباں پر بار دیگر انتظار آوے	ولہ	ابھی رونے پہ ظالم دل مرا بے اختیار آوے
دل زلف میں الجھا مجھے آرام یہی ہے	ولہ	میں صید بلاکش ہوں مرا دام یہی ہے
تار کی طرح کہیں زلف بتاں سے ٹوٹے	ولہ	یا الٰہی دل بیمار بلا سے چھوٹے
ضعیف سے دل بیمار اس قرینے سے	ولہ	اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینے سے
عشاق تیری گرمی بازار کر گئے	ولہ	اس جنس کو کہاں یہ خریدار کر گئے
اُڑ چکا دل مرا زملنے سے	ولہ	اُڑ گیا مرغ آشیانے سے
دیکھ کر دل کو مژگنی مژگاں		تیر خالی پڑا نشانے سے
ہم نے پایا تو یہ ستم پایا		اس خدائی کے کارخانے سے
غیر از دوئی کے مانع دیدار کون ہے	ولہ	وہ یار ہو گیا تو پھر اغیار کون ہے
بیم غضب رکھے ہے مجھے مغفرت سے دور		گر وہ کریم ہے تو گنہگار کون ہے
جاگا نہ کوئی خواب عدم سے کہ پوچھتے		آسودگان خاک میں بیدار کون ہے
میں مرگیا پہ آہ نہ پوچھا فغاں مجھ		درد جگر کسے ہے یہ بیمار کون ہے

۳۔ فرحت

فرحت تخلص شیخ فرحت اللہ نام۔ بیٹا شیخ اسد اللہ کا۔ اولاد سے قاضی مظہر کے، وہ قاضی مظہر کہ جانشین مرزا شاہ بدیع الدین مدار کے تھے۔ وطن بزرگوں کا ان کے ماوراء النہر ہے لیکن فرحت نے کہنے دلّی میں پرورش پائی ہے، اور عاشق مزاجی و دل بستگی ہی میں عمر گنوائی ہے۔ ہمیشہ بند عشق میں مسلسل مہرویوں کے گرفتار، اور سدا ورد عشق سے بیگانہ خوبوں کے یار۔ شاعر کہن مشق وہم صحبت شعراء نامدار شاہجہان آباد۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ عزیز میرا اخلاص مند تھا، اور حسرت کا موجد گر ندتھا۔ جب کہ دلّی سے مرشد آباد میں آیا، اور طور سکونت کا دیا ٹھیرایا، جو مجھ سے ہو سکتا تھا خبرگیران حال گاہ گاہ ہوتا تھا۔ غرض بہت تنگی معیشت کے ساتھ عزیز

کا نباہ ہوتا تھا۔ آخرالامر ۱۱۹۱ھ گیارہ سو اکانوے ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا، اور اس دارِ محن سے، خلاف اپنے تخلص کے بہت مغموم گیا۔ زبان ریختہ میں اُس نے بہت کچھ کہا ہے، یہ منتخب اُس کے دیوان کا ہے +

گذرے اگر چمن میں وہ گلعذار اپنا	وله	دیں چھوڑ بے کلی سے گل شاخسار اپنا
تاثیر آہ میں نے تالے میں سے ہے اثر کچھ		ہووے وہ آہ یارب کس طرح یار اپنا
جاوے کہیں بھڑک مت آتش سے دل کی میرے		لگ دور رہ مجھ سے دامن اسے کوہسار اپنا
اُس شوخ نے یہ پوچھا فرحت سے کل کہ تو نے		اس طرح کیوں گنوایا صبر و قرار اپنا
آنکھوں میں اشک بھر کر بولا نہ پوچھ ظالم		ہرگز نہیں ہے دل پہ کچھ اختیار اپنا

۴۔ فدوی

فدوی تخلص، میرزا محمد علی نام، معروف میرزا بچھو، متوطن تھے اُس اُجڑے نگر کے جو کہ مشہور شاہ جہان آباد، کر کے۔ نظم ریختہ میں اُستاد ہے۔ تلاش معنی میں فکر رسا رکھتے تھے، اور بیان حسن میں دل درد آشنا۔ علم موسیقی ہندی میں مناسبت بہت درست، اور تان کی سستی اور چستی کے جاننے میں نہایت چالاک و چست۔ چند روز انہوں نے اوقات مرشد آباد میں بسر کی ہے، لیکن اس سیر و تماشے کے ساتھ جو کہ وضع اہل نظر کی ہے۔ آخر شہر عظیم آباد میں سکونت کا اتفاق ہوا تو وضیع و شریف اس شہر کا ان کا مشتاق ہوا۔ فدویت میں معارف آگاہ شاہ گھسیٹا کے حاضر رہتے تھے، اور فیض صحبت سے اُس عرفان پناہ کے کسب علوم ظاہری اور باطنی کا کرتے تھے چنانچہ اُسی شہر میں اس کہن رباط مسافر کش ہستی سے دل اُٹھایا، اور بایوانِ مہمان دوست عدم میں اسباب سکونت کا بھجوایا۔ زبان ریختہ میں شاعر شیریں بیان ہے، یہ اُس کا منتخب دیوان ہے +

گر خاک پہ میری کبھی اے یار گذرنا	مت بھول کے ہرگز مع اغیار گذرنا
ایسا نہ ہو رندوں کی کزک ہو کہیں مندیل	میخانے سے اے شیخ خبردار گذرنا

ضد دیکھیو خوباں کی کہ اک آن کی خاطر
اُس بو کے تصدق ہیں کہ اُس گل کی گلی سے
کل یار کے کوچہ کی طرف گذریگا فدوی
ہم کو تو وفا سے نہیں اے یار گذرنا
تجھ کو نہیں آنکھوں کی قسم تیز نگہ سے
جب یار کے آگے سے چلے قافلہ دل کا
گر ننگ و حیا تم نہیں جانتے تو نہ جاؤ
شاید نظر آ جائے کبھو در پہ تو سو بار

مر جائے جو عاشق تو نہ زنہار گذرنا
ہے بادِ صبا کے تئیں سو بار گذرنا
مت آج سے تو اُس طرف اغیار گذرنا
ولہ
پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گذرنا
ٹک دل کو بچا سینے کے تو پار گذرنا
اے اشک تو ہو قافلہ سالار گذرنا
ہے مجھ کو تو اُس کوچہ سے لاچار گذرنا
فدوی کے تئیں ہو پسِ دیوار گذرنا

وہ کافر ہماری شب تار ہے — ولہ — جسے دیکھنا مہر کا عار ہے

بابُ القاف

۱ - قایم

قایم تخلص، شیخ محمد قایم نام، متوطن چاندپور ضلع بجنور (نامیا مجموعہ نغز) کے۔ نظم ریختہ میں اُستاد مسلم الثبوت تھے۔ ساتھ طبعِ بلند اور ذہنِ رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف۔ کہتے ہیں کہ ابتداے مشق میں مشورہ سخن کا انہوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا ہے، اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو میرزا محمد رفیع سودا سے ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے، راقم آثم کو تو طوطی گویائی کا اس سخن آفرین کے نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اُس شیریں مقال کے، اور خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبروے اُس نازک خیال کے۔ صفاے بندش سے اُس کی آئینہ کو طلب صفائی دام، اور خجالت سے اُس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اُس نظم صفا پرور کی رشک افزاے آب گوہر کی، اور موجزنی اُس طبع معنی خیز کی حسد انگیز چشمۂ کوثر کی۔ افسوس ہے ایسے شخص کا

اس جہان فانی سے اٹھ جاتا، اور داغِ حسرت سے دلوں کو ارباب فہم کے جلاتا۔ اس عندلیبِ شاخسار سحر بیانی نے شاید سنہ ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری میں، ادھر ہی نواح وطن میں اپنے، اس دار فانی سے سیر عالم باقی کی کی، اور عجب طرح کی ایذا جان کو اہل معنی کے دی۔ اگرچہ اقسام نظم میں کوئی قسم اس شیریں کلام سے نہیں رہی ہے، لیکن رغبتِ طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کہی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے ہے، یہ ان کے منتخب افکار سے ہے +

دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا — اٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا

ولہ
درد دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم — کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

ولہ
یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام اسی کا — پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا
خوباں کی طرف دیکھنے کا بند ہوں میں قائم — ملتے ہیں کہیں نام ہے بدنام کسی کا

ولہ
بنی بھوں سی ڈرا چاہئے کہ کہتے ہیں — کرے ہے کاٹ سروہی سے بیشتر اونا

ولہ
جب تک کہ ہے تو ہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ — جوں موج کہ نت لازمہ ہے آب رواں کا

ولہ
عہدہ سے اس صنم کے بر آیا نہ جائے گا — یہ ناز ہے تو ہم سے اٹھایا نہ جائے گا
کعبہ اگر چہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ — کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

ولہ
ہم سے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا — ہچکی گر آئے تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا

ولہ
کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر — مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

ولہ
دل پا کے اس کی زلف میں آرام رہ گیا — درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا

ولہ
میں اس چمن سے اور یہ مجھ سے چمن گیا — لے دل میں اپنے حسرت سرو چمن گیا
شیریں تو ساتھ خسرو کی کر ذوق سے معاش — پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہکن گیا
ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر — روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی میں لوٹ آپ ہی من گیا
روؤں گا زیر سایہ دیوار بیٹھ کر — جس دن تری گلی میں کوئی داؤ بن گیا

وله
زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات — ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات
خوب نکلے ہم اُس کے کوچہ سے — ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل — دل گرا شاید اضطراب میں رات

وله
بھلا اے ابر مژگاں اب تو بس کر — ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر

وله
بے شغل نہ زندگی بسر کر — گر اشک نہیں تو آہ سر کر
کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی — اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

وله
کیوں کیا مجھ کو تو صیاد گرفتار قفس — میں نہ شائستۂ بسمل نہ سزاوار قفس

وله
جب موج پر اپنی آگئی چشم — دریا دریا بہا گئی چشم

وله
اب کے جو یہاں سے جائینگے ہم — پھر تجھ کو نہ مُنہ دکھائیں گے ہم
ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سی ظالم — جب گالیاں نت کی کھائینگے ہم
آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں — اس عہدے سی کب بر آئیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا — ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
جوں چاہیئے چاہ کا سرشتہ — قایم ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

وله
نہ دل میں آب ہے نہ نم رہا ہے آنکھوں میں — کبھی روئے تھے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لئے — حباب وار ذرا دم رہا ہے آنکھوں میں

وله
میں کہا عہد کیا تھا رات — ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

وله
نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لڑیاں — یکایک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی پھر کلیاں

وله
جب اُسے غیر سے ہونین کھلانے کا شوق — سرمہ کے واسطے بھیجے ہے صفاہان مجھ کو

وله
راہ کے بیچ جو رکھتا ہوں اُسے گھیر کبھو — ہنس کے کہتا ہے کہ اب چھوڑ مجھے پھیر کبھو

وله
اتنی اے دیدۂ و دل مجھ پہ نہ بیداد کرو — دیکھیں کیا ہووے خدا کو تو ٹک اک یاد کرو

وله
کبھی دکھا کے کمر اور کبھی دہاں مجھ کو — نپٹ تہ تنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

تو اپنے واسطے اے باغباں نہ کاوش کر — نپٹ ہے سایۂ دیوار گلستاں مجھ کو

وله

جو کہ چہلیں تھیں سو ہاے گئیں وہ یار کے ساتھ — سر پٹکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ

ایک ہم خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے — بلبلو خوش رہو تم اب گل و گلزار کے ساتھ

میں ہوں دیوانہ سدا کا نہ مجھے قید کرو — جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

وله

تھی شرط مجھے اُس سے تو اک رات بسے کی — کیا ہے کہ دل اُس زلف سے ہرگز نہ بھر آیا

وله

تیغ چڑھ اُس کی سان پر آئی — دیکھیں کس کس کی جان پر آئی

وله

دہن کو تیرے پایا بات کہتے — ہماری جزرسی میں کیا سخن ہی

وله

دل ڈھونڈھتا سینہ میں مرے بو العجبی ہی — یاں راکھ کا اک ڈھیر اور اک آگ دبی ہی

وله

میں جاتا ہوں کعبہ سے اب دیر کو — بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے

وله

مردنِ دشوار میں یہ حال بے تقصیر ہی — حسرتِ دل سو طرف سے اُس کی دامنگیر ہی

قتل کرنے سے مرے تو بھی ہوا کچھ منفعل — غرق آبِ شرم میں اب تک دمِ شمشیر ہی

وله

مر جایئے کسی سے پہ اُلفت نہ کیجئے — جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

وله

ہمارا کوئی احوال کیا جانتا ہے — جو گذرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

وله

یاس میں تجھ غم سے میں اپنی بھی غم خواری نہ کی — دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی

دم بدم اس رنجش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ — دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی

بعد خط آنے کے اُس سے تھا وفا کا احتمال — لیک وہاں تک عمر نے اپنی وفا داری نہ کی

وله

دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے — شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے

گندمی رنگ جو ہے دنیا میں — میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہی

ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے

وله

گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

وله

زاہد درِ مسجد پہ خرابات کی تو نے — جی بھی یہی چاہے تھا کرامات کی تو نے

ایدھر تو میں نالاں ہوں اُدھر غیر نعبا میں
اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے

ولہ
مر ہی تجھ کو کیا پیارا نہیں ہے
پر اتنا بھی تو ناکارہ نہیں ہے

ولہ
بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قایم
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

ولہ
کیا ہی جھگڑا ہے یہ کہ جس کے حضور
آئینہ کی قلعی اُدھڑتی ہے
قایم آیا ہے پھر وہ بن ٹھن کر
دیکھیں کس کس کی یاں بگڑتی ہے

رباعی
کیا چشم ہے دنیا کہ یہ ارباب نعیم
بے قرب کریں ہم کو دکھا کر زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجے سجدہ
محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

مثنوی بردیہ

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
ان دنوں چرخ پر نہیں ہے مہر
گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے
سبزہ وہ شال کی رضائی ہے
دن کی کتنی پہر دھوپ میں اوقات
کالی کمل میں رات کاٹے ہے رات
چرخ کی اطلسی قبا ہے ہمیش
نہیں یہ کہکشاں ہے دانا گیش
ندی پر آ کے بیٹھے جو بگلا
پروں سے اپنے اوڑھے ہے دگلا
برف کوچوں میں یوں پڑی ہے صاف
جوں کہ اڑتا ہے پنبۂ نداف
کہرے کو دیکھ کہتے تھے سب یار
ٹھنڈی سی ہے فلک کے جی میں غبار
پر جو دیکھا ہے غور کریں آپ
نکلے ہے منہ سے آسماں کے بھاپ
باد چلتی ہے بسکہ تند اور سخت
روز و شب کانپتے رہے ہیں درخت
گرچہ سرما سے خاص و عام ہیں شل
پر کہوں کیا میں حال اہل دول
لپٹے رہتے ہیں رونی میں مجبور
جس طرح ناشپاتی و انگور

جا کے حلوائی کو جو دیکھو کہیں — بھنی چھٹ کچھ دکاں میں اس کے نہیں
قایم اب سردی کا ہے یہ نکد — شعر ہو گر خنک تو ہے معذور

مخمس

شیخ تو تا بود ہو وے یا ترا پندار نیست — بتکدہ ویراں ہوں یا ہوں برہمن یکبار نیست
کام کیا ہے مجھ کو گو ہوں راہب و پندار نیست — کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

عاشقوں کو رونے کی کچھ اور ہی ہوتی ہے دُھن — دیکھ ہم روتے ہیں لختِ دل جو جی چاہے تو چن
ہم نہ کہتے تھے تجھے ظالم کہ آ یہ بات سُن — ابر را با دیدۂ گریانِ من نسبت مکن
نسبتِ باریدگی دارد و لے خونبار نیست

دیکھ حال مرا اُٹھا کے سو سو حیلے — ساتھی بھاگے ہر اک طرف کو جی لے
کہتی تھی جو کنش میں نہ چھوڑوں گی قدم — سو اُس کے بھی ہو چکے ہیں کتنے ڈھیلے
رباعی

۲۔ قدرت

قدرت تخلص، شاہ قدرت اللہ نام۔ ساکن شاہ جہان آباد کے۔ مشہور سخنوروں میں سے تھے رشتہ دار تھے میر شمس الدین فقیر کے۔ صاحب مذاق تھے چاشنیِ درد و تاثیر کے تکلم ریختہ میں ذہن رسا رکھتے تھے۔ خاطر سخن گستر اور طبع معنی آشنا رکھتے تھے۔ طرز مضمون آفرینی سے ماہر، اور اک شگفتگی و برجستگی کلام سے اُن کے ظاہر۔ اکثر فکر اشعار فارسی کی بھی کرتے تھے، لیکن تکلم ریختہ پر مرتے تھے۔ تازہ کرنے میں مضمون کے اپنے ہم عصروں میں ممتاز، اور صفائی میں بندش کی نازک خیالوں سے ہمدم و دمساز تھے۔ وارستہ مزاجی کے یار، اور آزادہ حالی سے سروکار۔ ایک مدت سے دلّی کو چھوڑا تھا۔ امر و لہ و مرشدآباد میں تھے، اکابر اور اعزہ اُس شہر کے سب ان سے بر سر عنایت و امداد تھے۔ علی ابراہیم

خلف مرحوم نے لکھا ہے کہ مجھ سے ان کو اختصاص اور اتحاد تھا۔ واقعی عزیز اپنے طبقہ کا اُستاد تھا۔ شاید سنہ ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا۔ اور طبع کو صاحب طبعوں کے حد سے زیادہ پر ملال کیا۔ دیوان میں اُس صاحب قدرت کے ہر قسم کے اشعار ہیں۔ یہ غزلیں انکی منتخب افکار ہیں ◆

ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا
اے بادہ کشاں مژدہ کہ پھر ابر تر آیا

کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے
شاید تہِ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا

غفلت میں کٹی شام جوانی تری صد حیف
پیری میں تو ٹک چونک کہ وقتِ سحر آیا

وله

ترے حضور میں جب قصدِ عرضِ حال کیا
ہجومِ گریہ نے میری زباں کو لال کیا

میں داغ تازہ میں تو نے یہاں تلک ناخن
کہ ایک بدر کا کاسہ پر از ہلال کیا

ہوا ہے اُس کے گلے میں گرہ دمِ اعجاز
ترے لبوں نے مسیحا سے کیا سوال کیا

وله

ٹوٹی کمندِ بخت کا وہ زور رہ گیا
جب بامِ دوست ہاتھ سے کچھ دور رہ گیا

اوپر سے زخم گرچہ بہت ہو چلے ولے
ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا

وله

مدتوں سے رخنۂ دل یہاں جو بت مسدود تھا
یک ذرا کھولا تو دیکھا خانۂ پُر دود تھا

کبریائی کا جو دیکھا میں نے جس جا ظہور
اپنی اپنی حد میں جو پیشہ تھا اک نمود تھا

حالِ قدرت پوچھتا ہی کیا تو ظالم مجھ سے سُن
اُس کے بالیں پر دعا کو آج ہی موجود تھا

آہ جو اُٹھتی تھی درد دل سے تھی لپٹی ہوئی
اشک جو گرتا تھا سو لختِ جگر آلود تھا

وله

بیتابیوں سے یہ دلِ بیتاب رہ گیا
اپنی تپش میں جل کے یہ سیماب رہ گیا

آنسو تھمے ہیں پر نہیں سوکھی ہے چشمِ تر
دریا اُتر گیا ہے یہ گرداب رہ گیا

وله

ہم پہ ایامِ مصیبت آج پھر آنے لگا
یار گھر جانے لگا ہے وہ سے گھر جانے لگا

جب مسیحا دشمنِ جاں ہوں تو کب ہو زندگی
کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگا

مجھ کو غفلت نے بے خبر ایام فرصت کی ندی
آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

کب تلک ای نالہ زیر لب رہیں گا تو گرہ
حوصلہ باقی نہیں بس جی تو گھبرانے لگا

ولہ

دل سدا سینہ میں جلتا ہی رہا
لخت دل آنکھوں سے ڈھلتا ہی رہا

تو نے گو مجھ کو دلاسے میں رکھا
جی مرا تو بھی تو گھلتا ہی رہا

ولہ

دل ہوا اسیر زلف سیہ خام رہ گیا
صید ضعیف مرکے تہ دام رہ گیا

جب دیکھتا ہی مجھ کو تو دیتا ہے گالیاں
اپنے نصیب کا یہ اک انعام رہ گیا

آگے نہ چل سکا تری کوچے کو چھوڑ کر
خورشید جاکے تا بہ لب بام رہ گیا

قدرت کسے آسکے یہ کٹی کی بندگی
آنے سے اب تو نام و پیغام رہ گیا

ولہ

آتش فروز دل ہوتا حسن شعلہ رو کا
ہر اشک ہی شرارہ ہر آہ ہے بھبوکا

ڈھونڈھے ہے پاس اب کیا سینہ میں غم زدہ کے
مدت سے لٹ چکا یہاں سامان آرزو کا

کشتہ ہوں جان و دل سے تیرے خدنگ کا میں
بحر کماں میں ہیگا پیاسا مرے لہو کا

ولہ

تشنہ لب مرتا ہی نت موج دم شمشیر کا
اے غرور ناز کچھ بھی فکر اس نخچیر کا

خواب غفلت لگ گئی تھی ان جنوں دل کو ابھی
آہ پھر کس نے یہ چھیڑا سلسلہ زنجیر کا

ولہ

رنگ غلطان کشتگاں جس جا سے اڑ سکتا نہیں
ہوں اسیر ناتواں اس خاک دامنگیر کا

ولہ

گھر سے جس وقت وہ غارت گر ایماں نکلا
کفر سے گبر گیا دیں سے مسلماں نکلا

وہ دل جمع کرا تھا جو مغل سے لہونی ئ
تو بزیر شکن زلف پریشاں نکلا

ولہ

اس چشم سے ہو کے آب نکلا
سینہ سے دل خراب نکلا

جو نالہ جگر سے پار نکلا
لے سیخ پر اک کباب نکلا

خط آیا وے ہمارے خط کا
منہ سے نہ ترے جواب نکلا

ولہ

بیت الحزن میں شب کہ ترا انتظار تھا
کھٹکا ہر ایک دل کا مرے جی کے پار تھا

ادھر بھی ایک بار جفا کی عناں کو پھیر
دل ہو خدنگ دوست جگر ہو سناں طلب

ولہ

دست بہ ظلم سے تیرے ہیں جتنے ہم خراب
اس تو بھی ہووے گا عالم میں کوئی کم خراب

زخم سے دل کے ابھی اسے چارہ گر رہتا ہے جل — مت ڈبوئے فائدہ پھائے نہ کر مرہم غریب

وله
گھٹے رونا گھڑے سر کو پٹکنا — خوشا ایام اوقات محبت

وله
ہرزہ گردی سے رہائی سے کے چھوٹا — پھر مجھے زنداں میں اسنے زنجیر کھینچ
جان سے ہے وابستہ اُس پیکاں کے ساتھ — میرے پہلو سے نہ اپنا تیر کھینچ

وله
ذرا قفس سے قفس تو ملا کے رکھ صیاد — کہ تا اسیر کریں مل کے ایک جا فریاد

وله
جہاں نظر پڑے پاؤں تلے ملے کاغذ — سمجھ کے نامہ مرا ہاتھ میں نہ لے کاغذ
میں کیونکر اُس کو لکھوں خط عجب اشک و آہ سے یہاں — ادھر جلے قدم اور اُس طرف گلے کاغذ

وله
کسے جز خون دل میخانہ میں منظور ہے ساغر — مری آنکھوں میں تجھ بن دیدۂ ناسور ہے ساغر

وله
آہ رو سے پاک تیرے اس طرح آوے نظر — لخت دل جب چھا رہا ہو دیدۂ نمناک پر
یہ دل شوریدہ جیسے ساتھ ہو زیر زمیں — شور محشر ہی رہا قدرت کی مشت خاک پر

وله
تجلی جلوہ چاہے ہے تو صفائے سینہ پیدا کر — اگر دیدار کا طالب ہے تو آئینہ پیدا کر

وله
ہے نالۂ شام آتش و آہ سحر آتش — کیا زیست ہو اپنی ادھر آتش ادھر آتش
جز داغ تدارک نہیں اس داغ جگر کا — آتش کے جلے کو نہ کرے یہ جگر آتش
پھاہا ہو کو اگر داغ سی چھاتی کے چھڑا دوں — خاشاک کے پہلو میں چھپے آن کر آتش

وله
چل بسے دنیا سے بن دیکھے ترا دیدار حیف — لے چلے حسرت بھرا ہیاں سے دلِ افگار حیف
جرم پر تیری محبت کے ہمیں کرتے ہیں قتل — حفظ جاں کے واسطے گر کیجئے انکار حیف

وله
مرگ پہلی ہی جب تلک آئے فراق — ورنہ کیا جاؤں کہ سر پر کیا بلا لائی فراق

وله
زخم پہلو سے نہ پائی آہ دل ناکام تک — حیف پہنچا ہی نہ اپنا کار شوق انجام تک
صبح کے ہوتے ہی ہو جس کی یہ حالت تباہ — آہ وہ بیچارہ پھر جیوے گا کیونکر شام تک
کر چکا ہے کام اپنا یہاں تو درد انتظار — جب تلک پہنچے ہے قاصد اُس پیغمبر کام تک
ہم نہ کہتے تھے کہ تم مت چمن کی راہ چل — لے گئی آخر ہوائے گل شکنج دام تک

وله
رنگ کچھ اور ہی بدلتا ہے مرا جیتا تب دل
ہے گھڑی آتش کا پرکالہ گھڑی سیماب دل

وله
گرے تھے آکے اس در پہ سمجھ کر اپنا مامن ہم
اگر تو سے نہیں راضی تو جاویں آہ کس کن ہم

ہوائیں پھر گئی اس بزم کی اپنے نصیبوں سے
گئے جاتے ہیں اور سب دوست تیرے ایک دشمن ہم

شب ہجراں کو قدرت اس طرح ہم روز کرتے ہیں
کبھی سر کو پٹکتے ہیں کبھی کرتے ہیں شیون ہم

وله
جوں نقش قدم ہی ترے وے خاک نشیں ہم
تا مست نہ جھکیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم

نسبت ہے ہماری تری جوں سایۂ خورشید
جس جا نہیں تو ہم ہیں جہاں تو ہے نہیں ہم

وله
گئے وہ دن کہ پلک مارتے یاں دریا بہے
اب بعد خون جگر چشم کو تر کرتے ہیں

تیرے جاں سوختہ خورشید قیامت کے تئیں
ہر سحر پنبۂ ناسور جگر کرتے ہیں

بھیج مت مرہم کافور تو قدرت کے حضور
یہ علاج اور ہی زخموں پہ اثر کرتے ہیں

وله
ابرو ترے کہتے ہیں کہ میں تیغ دو سر ہوں
عاشق کا یہ دعویٰ ہے کہ میں سینہ سپر ہوں

شایستۂ دنیا نہ سزاوار ہوں دیں کا
اے واے میں قدرت نہ ادھر ہوں نہ اُدھر ہوں

وله
دل سے کہا سناں نے کہ سینہ میں یاں رہوں
ناوک یہ پوچھتی ہے بھلا میں کہاں رہوں

قدرت بزیر خاک بھی آرام کب ملے
یہ درد و داغ ساتھ ہے میرے جہاں رہوں

وله
آگ اُس داغ کو لگیو کہ نمک سود نہیں
پھوٹے وہ آنکھ جو لخت جگر آلود نہیں

مرحبا آتش دوری کہ جلایا ایسا
جل بجھے سر سے لے پاؤں تلک اور دود نہیں

زخم پر زخم لگے تب ہو تسلی دل کی
حوصلے پر مرے اک زخم کچھ افزود نہیں

وله
شام کو دھوتا ہوں سو خون جگر سے آستیں
صبح خون آلودہ ہے پھر چشم تر سے آستیں

تو بھی کم ابر بہاری سے نہیں اے چشم تر
کر دے اب رشک چمن خون جگر سے آستیں

لخت دل اور اشک ہرگز خاک پر گرنے نہ دے
بھر لے اے قدرت تو ان لعل و گہر سے آستیں

وله
جنوں تیرے ناخن مگر گھس گئے ہیں
کہ عقدہ پڑا ہے بکار گریباں

ٹپکنے لگے اشک گلگوں مژہ سے
پھر آئی ہے فصل بہار گریباں

قافلے کے قافلے اس رہ میں جوں نقشِ قدم	وله	ہو گئے پامال تیرے حسرتِ پابوس میں
بند کر مرہم سے داغِ سینۂ پُر نور کو	وله	کوئی بجھاتا ہے ارے ظالم چراغِ نور کو
داغ نے دل کو مرے تنہا نہ چھوڑا ایک دم		زخمِ سینہ سے سدا اُلفت رہی ناسور کو
تب مزا دیوے گا قدرت زخمِ سینہ پر نمک		دے سرِ ناخن سے پہلے آشتی انگور کو
نہ جا اس بزم سے ہرگز جھٹک مت طرفِ داماں کو	وله	نہ دے برباد اے ظالم غبارِ خاکساراں کو
ہوا دستِ جنوں سے تار تار از بسکہ پیراہن		گریباں ڈھونڈھے ہے دامن کو اور دامن گریباں کو
تم نے تو منہ چھپایا اُس زلفِ عنبریں میں	وله	یہ شامِ غم ہماری اب کس طرح سحر ہو
میں رکھتا ہے ابرو کماں کے نشاں گو	وله	ہما چھیڑے پیوست ہے استخواں کو
گلوگیر ہے یاں تلک ناتوانی		کہ سینہ سے لب تک نہیں رہ فغاں کو
اُڑائی زبس خاک ماتم میں دل کے		کیا ہم نے آخر زمیں آسماں کو
نوح کشتی سے خبردار کہ یاں چھاتی پر	وله	مرہمِ تازہ ناسورِ کہن چھوٹے ہے
کس کی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے	وله	جو شرر دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کچھ یہاں سر کر گئی		اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے	قطعه	کیا ہی ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ روس ہے
سنتے ہی ہیبت یہ بولی اک تماشا میں تجھے		چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف		جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے		یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمتِ دنیا سے آج		کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے
کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسخیرِ ریا		آج رہنِ جامِ مے پھر خرقۂ سالوس ہے
سینہ اُس کا ہے دل اُس کا ہے جگر اُس کا ہے	وله	تیرِ بیداد جدھر رُخ کرے گھر اُس کا ہے
اس گلی سے جو کوئی گذرے سو ہی سر کندہ		دیکھ اُس راہ نہ چل راہ گذر اُس کا ہے

لختِ دل نوکِ مژہ پر نہ سمجھ اے ہمدم
تخمِ غم دل میں جو بویا تھا ثمر اس کا ہے

ولہ

نہ تھی تاب نگہ جب لگ گیا وہ دور آنکھوں سے
نہ ہونا چشم کا بہتر تھا ایسی کور آنکھوں سے

جہاں جاوے وہ نورِ دیدہ آنکھوں کے مقابل ہم
جدا ہوتے نہیں جاوے نگہ کو دور آنکھوں سے

زباں قدرت کی ضعفِ ہجر سے از بس ہے لکنت میں
اشارت بات کی کرتا ہے جوں رنجور آنکھوں سے

ولہ

گر اقلیمِ قناعت کا سفر تا تجھ پہ روشن ہو
کہ چشمِ مور سے بھی تنگ تر ملکِ سلیماں ہے

لبِ قدرت سے جز فریاد کچھ ریزش نہیں کرتا
یہ کچھ شاعر نہیں ہے اپنے دل کا مرثیہ خواں ہے

ولہ

نہ واقف کارواں سے ہوں نہ کچھ آگاہ منزل سے
گیا میں وادیٔ اُلفت کو لے اک جنبشِ دل سے

گئے وہ دن کہ بہتے تھے پڑے نالے ان آنکھوں سے
سرِ مژگاں تلک اک اشک اب آتا ہے مشکل سے

کرے تو ذبح جب تک اس کو یہ مفت مرتا ہے
نہ ہو غافل ارے صیاد صیدِ نیم بسمل سے

ولہ

غنیمت بوجھ ملنے کو کہ یہ عالم اک افسوں ہے
کدھر فرہاد شیریں ہے کدھر لیلیٰ و مجنوں ہے

تو کیا ساماں پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکہ گذرے ہے
یہ سر ہے اور زانو آستیں اور چشم پُرخوں ہے

ولہ

آساں نہ کٹے گی یہ جدائی کی جو شب ہے
مشکل ہے قیامت ہے مصیبت ہے غضب ہے

ولہ

دل پُر داغ ہے اور حسرتِ پابوسی ہے
دستِ اُمید ہے اور دامنِ مایوسی ہے

دلِ گم گشتہ خبردار کہ یاں سینہ میں
تیرِ بیداد سدا در پئے جاسوسی ہے

دمِ جاں بخش کی اُس کے جو پڑی ہے یہ دھوم
لبِ عیسیٰ سے مگر تیری زباں چوسی ہے

ولہ

جس جگہ جلوہ ترا مایۂ مدہوشی ہے
یاد میں اپنے اگر ہے تو فراموشی ہے

آہ یہ کون سی منزل ہے کہ رکھتے ہی قدم
نقشِ پا سے مرے سجدہ کو ہم آغوشی ہے

ولہ

سرگشتہ ترے لئے جہاں ہے
اے خانہ خراب تو کہاں ہے

جو زخم کہ ہو چکے نہ ناسور
وہ زخم نہیں وبالِ جاں ہے

قدرت ٹک کھول چشمِ عبرت
گر فکرِ سراغِ رفتگاں ہے

جو نقشِ قدم ہے اس زمیں پر
آئینۂ حالِ رہرواں ہے

اشک اب آ نسکتی کچھ تھم رہے	ولہ	لخت دل مژگاں پہ شاید جم رہے
اب تو اس منزل سے نہیں اُٹھتے قدم		ہمرہاں آگے چلو تم ہم رہے
ہر آن اک ستم ہے ہر لحظہ اک جفا ہے	ولہ	کوچہ ترا ہے ظالم یا دشتِ کربلا ہے
ملتا نہیں کسی سے اس پر یہ کیا مصیبت		یارب یہ دل ہمارا کس سے جدا ہوا ہے
ہو گرد باد جیدھر ہم کو اُدھر ہے جانا	ولہ	صحرا میں گمرہوں کا یہ خضر رہنما ہے

باب الکاف

۱-کلیم

کلیم تخلص، شیخ محمد حسین نام- شاہ جہان آبادی- مشہور سخنور ہے دلی کا۔ معتقد تھیوں میں میر تقی میر تخلص کے تھا- ایک رسالہ عروض و قافیہ کا اس نے زبان ریختہ میں لکھا ہے، اور فصوص الحکم کا ترجمہ بھی زبان ہندی میں کیا ہے- ایک نثر اور بھی رنگین زبان ریختہ میں ریختہ قلمِ معنی رقم رکھتا ہے- لیکن باوصف اس خوش گوئی کے کلام مشہور بہت کم رکھتا ہے- عہد دولت میں احمد شاہ بن فردوس آرامگاہ کے ایام اس کے شعر و شاعری کا تھا، اور زمرہ پروانان شاہ جہان آباد کے ساتھ ہم صفیر و ہم نوا تھا- چنانچہ دلی ہی میں اس خرابۂ دارِ فانی سے گذرا، اور مقیم بیت المعمور کا شانۂ باقی کا ہوا- صاحب دل تھا اور شاعر شیریں بیان تھا- یہ اُس کلیم طور سخندانی کے کلام سے ہے •

گو روضۂ رضواں کو میں اک آن میں دیکھا	ولہ	جب گل کی طرح جھانک گریباں میں دیکھا
لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس	ولہ	وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا
قبر میں بھی لئے ہمراہ گیا اپنے کلیم	ولہ	آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا
رکھتا ہے زلف یار کا کوچہ ہزار پیچ	ولہ	اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ مار پیچ
ہو چکا حشر گئی دوزخ و جنت کو خلق	ولہ	رہ گیا میں ترے کوچے میں گرفتار ہنوز

وله
پوچھ مت غم کی داستانِ ای دل — گر پڑا ٹوٹ آسماں اے دل

وله
پیری کی بھی سیر کر گئے ہم — اس پل سے بھی بس گذر گئے ہم
واں غصہ ہوئے رقیب پر تم — یاں مارے ادب کے مر گئے ہم

وله
بات اُس کی زبان پر آئی — پھر خرابی جہان پر آئی

وله
غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے — غرض ہم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

وله
اُس کے ابرو کی اگر تصویر کھینچا چاہیئے — اوّل اپنے قتل پر شمشیر کھینچا چاہیئے

وله
عرق ہی منہ پہ ترے یا گلاب ٹپکے ہی — عجب ہے مجھ کو کہ شعلہ سے آب ٹپکے ہی
تجھے میں آنکھوں میں کیونکر رکھوں کہ ہی برسات — پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے

رباعی
گلرو تو چمن میں اچپلی سے نہ گیا — یہ دل بھی کلی سے بے کلی سے نہ گیا
جو کوئی گیا دل کو گیا چھوڑ یہاں — دل سے تو کوئی تیری گلی سے نہ گیا

رباعی
دنیا کے ہاتھ سے جو دل ریش ہیں ہم — اس واسطے یاں عاقبت اندیش ہیں ہم
دنیا داری و نوکری محنت و کسب — جب کچھ نہ بنا کما کہ درویش ہیں ہم

بابُ اللّام

ا۔ لُطف

لطف تخلص، میرزا علی نام۔ راقم ہے اس چند اوراق پریشان کا، کہ مانند نامۂ اعمال اپنے کے سیاہ کئے۔ اور اسمِ گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے متوطن استرآباد، نجابت بنیاد کے ہیں۔ سنہ ۱۱۵۴ گیارہ سو چون ہجری میں نادرشاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد میں تشریف لائے اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی، مصدرِ عنایات بادشاہی ہوئے۔ آگے بیان امورات دنیوی باعث ہی طول کلام کا، اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خلص

رعام کا۔ بہرحال غزل فارسی کے کہنے میں حضرت کو یدِ طولیٰ تھا، اور ہجری تخلص آپ کا تھا۔ اس تذکرے
یں اشعار ہندی کا التزام ہے، اس سبب سے یہاں لکھا نہیں گیا آپ کا کلام ہے۔ اصلاح خدمتِ فکری
لی اس ہیچمدان کو آپ ہی کی جناب سے ہے، اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے۔ یہ غزلیں
یزے کتنی ایک کہ سراب گاہ طبع ناقص کے فراہم ہوئے تھے، عرضِ خدمت اربابِ معنی کے
کئے جاتے ہیں۔

پاس ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار — شمع ساں سوزِ شبِ ہجراں زباں پر لائیں کیا
بلبل و گل میں وہ جوشش سرو قمری میں یہ ربط — گلستانِ دہر میں ہم دل کو تئیں الجھائیں کیا
غیر لب پر شکایت ہے مری جانب سے آج — سُن کے جیسے کے قدرداں اب دیکھیں فرمائیں کیا
چمن کو گل جو تری مے کشی کا دھیان آیا — ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا
رہا جو زندہ شبِ تیرہ فراق میں قیس — سیاہ خیمۂ لیلیٰ کا اُس کو دھیان رہا
جو عمرِ خضر ہو شاید تو وصل ہووے نصیب — یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا
نہ آنکھ بھر کے کبھو دور سے ہم تو دیکھ سکے — وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا
نہ کر اے بلبلِ دل سوختہ صیاد کا شکوا — کہ جاں بازوں کو دیں میں کفر ہی جلاد کا شکوا
نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے — زبانِ تیشے کوئی سُنے فرہاد کا شکوا
میں اپنے سرو قامت سے ہی کیا شاکی تمام گلشن میں — تسلی ہو گئی قمری سے سُن شمشاد کا شکوا
نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں — کرے ہے اک جہاں اُس خانماں آباد کا شکوا
ترے کانوں تلک بھی لطف کچھ آواز آتا ہے — ہے اک عالم کو تیرے نالہ و فریاد کا شکوا

ولہ

ایک دن حالِ دلِ زار نہ دیکھا نہ سُنا — سچ تو یہ تجھ سا بھی دلدار نہ دیکھا نہ سُنا
دیکھ کر نبض مری رو کے لگا کہنے طبیب — کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا نہ سنا
وہ مجھے تم نے دکھایا ہے کہ یعقوب نے جو — کبھی اے دیدۂ خونبار نہ دیکھا نہ سُنا
لختِ دل کرتا ہے کیا کیا صفتِ مژگاں پہ نمود — اس جواں سا بھی نمودار نہ دیکھا نہ سُنا

چشم اور گوش زمانہ ہیں معتر اس کے لطف
ثانیِ حیدرِ کرار نہ دیکھا نہ سنا

وله

ہے اس شدت سے رنگینیِ لبِ یار کا چرچا
کہ بھولا عندلیبوں کو گلِ گلزار کا چرچا

ڈھکا رہ جائے اسرارِ محبت تو غنیمت ہے
ہوا ہے اب حکیموں میں مری آزار کا چرچا

برنگِ پیکرِ تصویر رہتا ہوں سدا ساکت
ہے اس پر اس کی محفل میں مری گفتار کا چرچا

رہیں ہم یار کو چھیڑے سے یہ فرصت کہاں ہم
کہ اب دن رات بیٹھے کیجئے اغیار کا چرچا

بیانِ ہمدمِ دل کس لطف سے کرتے ہیں افسوس
جو ہوتا بزم میں اس کی کبھی اشعار کا چرچا

نہ ہے غفلت کہ ہم دنیا کو بزمِ عیش سمجھے تھے
کھلی چشمِ حقیقت میں تو کام اژدہا نکلا

نہ کر اے لطف ناحق رہروانِ دہر سے حجت
یہی رستہ تو کھا کر پیچ سے کعبے کو جا نکلا

وله

از بس نہ ہوا ہم سے سرانجامِ محبت
شرماتا ہے دل لیتے ہوئے نامِ محبت

فرہاد سا نہ رنگ نہ مجنوں سا کیا حال
کس منہ سے اسے بھیجیے پیغامِ محبت

وله

کیونکر نہ بھلا ہمدم ہو زندگی اب مشکل
ہیں دل میں تو سو باتیں ہو جنبشِ لب مشکل

اک آہ کے کرنے کو سوچا ہئیں تمہیدیں
کس سے کہیں حالِ دل ہے آہ عجب مشکل

وہ لاکھ بہانے ہوں نت روئے دو آنسو
دو دن کا ہوا جینا ہم کو تو غضب مشکل

وله

یاروں نے یہ تو کہیئے کیا کیا سکھائیاں ہیں
بے وجہ کچھ نہیں یہ ہم سے کھنچائیاں ہیں

میں کیا ہوں باختہ رنگ اس شعلہ رو کے آگے
رہتا ہے یہی منہ پہ چھٹتی ہوائیاں ہیں

اک جوئے شیر بہہ لے اے آفریں ہے فرہاد
کیا بے ستوں میں خوں کی نہریں بہائیاں ہیں

کب غنچۂ دل اپنا واشد صبا ہو تجھ سے
گو سیکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں

طاقت حجاب سا اک نظارہ کی ملی ہے
ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں

کعبہ سے ہم نہ واقف نہ بتکدہ سے آگاہ
یہاں آستانِ دل ہے اور جبہ سائیاں ہیں

اس قد کا سرو سے ذکر کچھ نامناسب اور بڑی بات
غنچہ کو دل پہ ہے ڈھب باتیں بنائیاں ہیں

اے لطف اس غزل پہ کہنا بقول سودا
یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

او میاں تیغ والے اور اک زخم — کب سے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں
برنگ گُل جس نمط خزاں میں چھٹیں — لخت دل یوں مژہ سے جھڑتے ہیں
بس غم یار اب خبر جلدی — ورنہ اب یار ہی نبڑتی ہیں

ولہ

تم جو بزم عیش سے واں اور صحبت دلریاں — ہم ہیں کنج غم میں یہاں اور جان سی بیزاریاں
تم کو سیر باغ و گلگشت چمن کا واں ہے شوق — یاں بدن پہ ہے ہجوم داغ سے گلکاریاں
وھیان ہے آرائشِ زلف پریشاں کا تمہیں — یاد ہیں حال پریشاں کی مرے کچھ خواریاں
تم صفا ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں — ہم پہ یاں موئے بدن کرتے ہیں نشترزاریاں
تم نے دکھلائی وہاں پیٹ اور چوٹی کی پھبن — یاں مری چھاتی پہ ہیں کالے سے لہریاں
نیک و بد دونوں سے یہاں ہم نے تو آنکھیں مُند لیں — تم وہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادوگاریاں
یہاں برنگِ پیکرِ تصویر ہم خاموش ہیں — گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں
قہقہے تم مارتے ہو واں باوازِ بلند — دشمنوں سے یہاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں
ہر مریضِ غم کی جان بخشی کا ہے تم کو دھیان — کھنچ گئیں یاں طول شدت سے مری بیماریاں
اضطرابِ دل سے بے پردہ ہوا یہاں رازِ عشق — سوجھتی ہیں واں تمہیں ہر بات میں تہ داریاں
کیا کسی سے بات کیجے بھولتے اک دم نہیں — اُن بھلاؤں سے وہ باتوں میں تری عیاریاں

ولہ

نہیں یہ شیشہ مت ای محتسب بجا دمو میں — دھرا ہے آبلۂ دل ہمارے پہلو میں
کب اپنی چشم میں طوفان نوح کو ہو قدر — نہاں ہے یہاں وہی عالم ہر ایک آنسو میں
اگرچہ فرق زمیں آسماں کا ہے تاہم — ملے ہے وضع فلک کی بہت تری خو میں

ولہ

غبار بیکسی سے کیا مزر پاکیزہ جوہر کو — کہ بخشے جلا گرد یتیمی آب گوہر کو
گندھا سر سے مانندِ قلم گر ہے سرِ شاہی — نہ آساں بھیجو پانا سیہ بختی افسر کو
کبھی تو خاکساروں کا بھی غم خانہ کرو روشن — نہیں گو کچھ بھی نقشِ بوریا تو ہوگا بستر کو
چھلکتا عمر کا اک دم میں پیمانہ ہے ای ساقی — وفا دشمن شتابی کر فدا لبریز ساغر کو

پھرا مجنوں کا دل سنگِ ملامت سی نہ مرنے تک
پڑا ہی چاہیئے بحرِ جنوں میں بار لنگر کو

کیا ہم نے تو ترکِ مدعا کو مدعا اپنا
خدا توفیق بخشے نیک چرخِ سفلہ پرور کو

وله

نہیں معلوم کیا اس سینۂ سوزاں میں پنہاں ہے
کہ ہر تارِ نفس جوں رشتۂ شمع آج سوزاں ہے

نہ میں فرہاد ہوں ای عشق نہ مجنونِ دل خستہ
مرا ہی منتظر تبلا تو کیوں کوہ و بیاباں ہے

تری طرزِ سخن پہنچی کہیں اے لطف گلشن میں
ترے انداز سے بلبل چمن میں اب غزل خواں ہے

وله

جس دن سے ہم جنوں کے ہیں داماں لگے ہوئے
دامن کی جا یہاں ہیں گریباں لگے ہوئے

اللہ رے قید خانۂ ہستی کہ دم کے ساتھ
ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگے ہوئے

رویا میں دیکھ مرقدِ مجنوں کو دھاڑ مار
تھے جائے گل درختِ مغیلاں لگے ہوئے

یاں سے چھٹا اسیرِ بلا اس گلی میں آج
ہیں تو وہ ہائے گنجِ شہیداں سے لگے ہوئے

بیمار کا ترے تو کھلا حال بعدِ مرگ
سینہ میں زخم تھے کئی پنہاں لگے ہوئے

یارانِ پیش رو ذرا ٹھہرو کہ جوں جرس
ہم پیچھے پیچھے آتے ہیں نالاں لگے ہوئے

رکھ سوچ کر قدم مرے وادی میں گردباد
پاؤں سے اپنے ہیں یہ بیاباں لگے ہوئے

کوئی تو میرے ناصحِ دانا سے یہ کہو
دل چھوٹتے ہیں باتوں میں ناداں لگے ہوئے

کیا دن تھے وہ بھی لطف کہ رہتے تھے مثلِ زلف
کانوں سے اس کی ہم سی پریشاں لگے ہوئے

وله

خورشید کی بھی آنکھ فلک پر جھپک گئی
ٹک جو گرہ نقاب کی اس کے سرک گئی

وله

سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے
اب کی فصلِ گل میں ہم بے طرح دیوانے ہوئے

شہر میں پایا نہ تیرے جور سے شہرا کہ اب
گھر بہ گھر ظالم مرے مذکور افسانے ہوئے

بزم میں آیا جو شب وہ گل رخِ خوں شمع سے
بلبلوں کی طرح جی دینے کو پروانے ہوئے

سنتے ہیں کی محتسب نے بیعتِ دستِ سبو
مژدہ مے نوشاں کہ پھر آباد میخانے ہوئے

تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم
آشنا ہو تجھ سے اک عالم سے بیگانے ہوئے

وله

روشن ضمیر کیونکہ نہ ہوں دل کے داغ سے
خورشید کو ہے کسبِ ضیا اس چراغ سے

وہ خود فروش آگیا بارے چمن میں کل — بوئے خودی نکل گئی گل کے دماغ سے
ہو وے فضائے ہستیِ موہوم کا برا — کنجِ عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے
اُس گلبدن بغیر ہمیں سیرِ باغ میں — صوتِ ہزار کم نہیں فریادِ زاغ سے
جس دل نہ دے کو نغمۂ بلبل ہو بانگِ زاغ — کیا خاک وہ شگفتہ ہو گلگشتِ باغ سے

ولہ

دیکھا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی — اُن سے ہیں مسدود راہیں نامہ و پیغام کی
رخصت ای اہلِ وطن اب ہم ہیں اور آوارگی — حق رکھے بنیاد قایم گردشِ ایام کی
یاد نے اُن تنگ کوچوں کی فضا صحرا کی دیکھ — ہر قدم پر جان ماری ہے دلِ ناکام کی
گردشِ چشمِ بتاں کے بسکہ ساغر نوش تھے — گردشِ گردوں کو ہم کہتے تھے گردش جام کی
جب سے کھینچا لطف رنجِ فرقتِ یاراں دیا — اب ہوئی معلوم محنت گردشِ ایام کی

کیوں دل پہ سے جادو اُن آنکھوں کا نہ چھن جائے — جس پر کہ پڑے آنکھ سو دیوانہ سا بن جائے
پلکیں وہ نکیلیں کہ نظر جب پڑے اُن پر — سینہ میں یہ عالم ہو کلیجہ کا کہ چھن جائے
بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت — اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

ولہ

کیا سبب بتلائیں ہنستے ہنستے باہم رک گئے — خود بخود کچھ وہم کچھ ادھر ادھر ہم رک گئے
دیر تک ضبطِ سخن کل اُس میں اور ہم میں رہا — بول اُٹھے گھبرا کے جب آخر کے تئیں دم رک گئے

ولہ

ادھر سے جتنی یگانگت کی اُدھر سے اُتنی ہوئی جدائی — بڑھائی تھوڑی سی جب ادھر سے بہت سی تم نے ادھر گھٹائی
نہ ہم سے بگڑو نباہ وو جی نہیں ہے کچھ تم کو دھیان اس کا — کہے گی خلقت کہ ہو چکی بس وہ دیکھو دو دن کی آشنائی

رباعی

جنت سے کہے بزم مری بو دیکھو — یوں جام کہے جم سے کہ مجھ کو دیکھو
ہر آئینہ آئینہ محل کا تیرے — کہتا ہے سکندر سے کہ منہ تو دیکھو

رباعی

منہ تکتی ہیں کیا صاحبِ تاج و دیہیم — جو خاک نشینوں کے تئیں جانے سقیم
ہم تک اُٹھا دیکھیں نہ گردوں کی طرف — گر خم نہ ہو ماہ نو برائے تعظیم

باب المیم

امیر

میر تخلص، نام نامی اس نگین خاتم سخن آفرینی کا میر محمد تقی ہے۔ متوطن اکبر آباد کے۔ سراج الدین علی خاں آرزو تخلص آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے۔ ابتدائے سن شعور سے پرورش انہوں نے دارالخلافہ شاہ جہان آباد میں پائی ہے، اور خان مذکور کے فیض صحبت سے تکلم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے۔ تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے، فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے۔ جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں چشم خوردہ بیں رکھتا ہے، اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے۔ تو وہ اس بات کو جانتا ہے، اور اس رمز کو پہچانتا ہے۔ کہ میر شیریں مقال میں، اور ریختہ گویان سابق و حال میں، نسبت خورشید و ماہ ہے، اور فرق سفید و سیاہ ہے۔ بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا، تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ غرض اس تردد سے زبان قلم کی، اور اس خراش سے عارض رقم کی، مرادیہ ہے کہ ناقدر دانی سے اغنیا کی، اور نافہمی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوا شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔ جن ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنو کو گئی، تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب سیر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے، اور جوانان نو مشق مربی گرمی قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔

زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنو پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست حمالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہل تمیز ہیں، کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے

نوجوان غورکے میں مویز ہیں۔ اب بھی جو بوجہ تمکنتِ معنی کا جز بہ ثقیل طبع سے ترازو کرکے وہ دکھلاتا ہے ہوا ان اگر کوہ بو قبیس ہے تو تحمل سے اُس کے کمر چُراتا ہے۔ بہر تقدیر غرض جب میرزا محمد رفیع سودا بلدۂ لکھنؤ میں اس دارِ فانی سے عالمِ باقی کو سدھارے، تو میر مذکور شاہ جہان آباد میں تھے ۱۱۹۷ھ گیارہ سو ستانوے ہجری میں رایاتِ عزم اس صاحب لشکرِ مضامین تازہ کے حرکت میں آئے، اور بہ خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعتِ فاخرہ دیا، اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کرکے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی نقصور رہا۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہدِ وزارت میں آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، وہی حال ہے، جو اوپر مذکور ہوا۔ اقسامِ نظم میں یہ صدر نشین بارگاہِ سخندانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظمِ غزل میں یدِ بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم میرزا محمد رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرزِ مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے، خصوصاً دریائے عشق، جوان کی مثنوی ہے، اک جہان کے مرغوب ہے۔ یہ رہنما قومِ سخن سرمایہ گان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہان ہے یعنی صاحبِ چار دیوان، خوش بندش خوش بیان ہے مثنویاں بھی متعدد ان سے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخبِ افکار ہیں +

اس دور میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا

اُمیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

ولہ

چمن میں گل نے جو کل دعوے جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

ولہ

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

دل کا نہیں ٹھکانا حالت جگر کی گم ہے
تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

ولہ

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے بُت خانے
نگاہِ مست نے ساقی کے انتقام لیا

وہ کج روش نہ ملا راستے میں ہم سے کبھو
نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا

پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا
نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا

اُس آئینہ کے مانند زنگار جس کو کھا جائے
کام اپنا اُس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا

لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور اُس کے
کارِ شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا

مستوری خوبروئی دونوں نہ جمع ہوویں
خوبی کا کام کس کے اظہار تک نہ پہنچا

یوسف سے لے کے تا گل پھر گل سے لے کے تا شمع
یہ حُسن کس کے لے کے بازار تک نہ پہنچا

ولہ

گل کو محبوب میں قیاس کیا
فرق نکلا بہت جو باس کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

ولہ

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر پڑا جو میر
یک سر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

ولہ

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

گذرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر دیکھنا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

یک قطرہ خوں ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

ولہ

سر سے باندھا ہی کفن عشق میں تیرے یعنی
جمع ہم نے بھی کیا ہی سر و ساماں یکجا

ولہ

دل پہنچا ہلاکت کو بہت کھینچ کسالا
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ

کندی ہی لہو واں سرِ ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

دل کے جاتے کا نہایت غم رہا
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

تجھ کو میرے حال سے تھی آگہی
نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

کلہ سرکشاں جہان میں کھینچا تھا ہم نے میر
پایانِ کار مور کا خاک قدم ہوا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کچھ کہ یہاں ہے سو افسوس ہی جوانی کا

وله

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

وله

جو یہ دل ہے تو کیا سرانجام ہوگا
تہ خاک بھی خاک آرام ہوگا

وله

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

وله

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یہ آگے درد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

وله

خوبی کو اُس کے چہرے کی کب پہنچے آفتاب
ہے اس میں اُس میں فرق زمین آسمان کا

کام دل میں مرا تمام کیا
غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا

تیرے کوچے کے رہنے والوں نے
یہیں سے کعبہ کو سلام کیا

وله

وصفِ خط و خال میں خوباں کی میر
نامہ اعمال سیہ کر گیا

وله

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

تو اب گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

مجھے کام ہر دم ہے رونے سے ناصح
مرے منہ کو کب تک تو دھوتا رہے گا

مرا خوں تجھ پہ خوں ثابت کرے گا
وصیت میر نے مجھ کو یہی کی تھی
کیا بعد مرگ یاد کروں گا وفا تجھے
سفال مجہ ست بن پھر قلقل مینا نہ ہووے گا
آرام عدم میں نہ تھا ہستی میں نہیں چین
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
کس کا کعبہ کس کا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
شیخ جو ہے مسجد میں بیٹھا رات کو تھا میخانے میں
کاش اب برقع منہ سے اٹھا دو ورنہ پھر کیا حاصل ہے
یہاں کے سفید و سیہ میں دخل جو ہے سو اتنا ہے

وله کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا
کہ سب کچھ ہونا اک عاشق نہ ہونا
وله سہتا رہا جفا ہی میں جب تک جیا کیا
مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا
وله معلوم نہیں میرا ارادہ ہے کہاں کا
وله دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
چاہتے ہیں جو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کوچے کے تیرے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا
آنکھ موندے پر ان نے گو دیدار کو عام کیا
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

زندگانی بھی ایک وقفہ ہے
ضعف یہاں تک کھنچا آ صورت گر
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
رہ گیا ہاتھ میں قلم لے کر

کام آنے کا نہیں ایک بھی یار آخر کار
مشت خاک اپنی جو پامال ہے یہاں اس پہ نہ جا
میر گم کردہ چمن زمزمہ پرواز ہے ایک
ناتوانی سے نہیں نالہ فشانی کا دماغ
گوش کو ہوش ہی ٹک کھول کے سن شور جہاں
گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل

وله ہاتھ سے جائے گا سر رشتۂ کار آخر کار
سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخر کار
وله جس کی لے دام سے تا گوش گل آواز ہے ایک
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
وله اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

سیر کر عندلیب کا احوال
وله ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال

ولہ

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں — وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہے کہتا ہے یہی — کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں
چلا نہ اٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میر — ابھی میں اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

ولہ

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہو کیا نہیں — تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
ناز بتاں اُٹھا چکا دیر کو میر ترک کر — کعبہ میں جا کے بیٹھ میاں تیرا اگر خدا نہیں
گردش فلک کی کیا ہے جو دور قدح میں ہیں — دیتا رہوں گا چرخ مدام آسماں کو میں
عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میر سے — پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں

ولہ

صد تمنا سے یار رکھتے ہیں — تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
پیر کرتے ہیں میر صاحب عشق — ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

ولہ

دن گذرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو — رات جاتی ہے اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں میں میر — یار مستغنی ہے اُس کو مری پروا کیا ہو

ولہ

عشق کا مغز نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب — کرے تدبیر جو یہ درد وہ دوا رکھتا ہو
ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر — درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

ولہ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ولہ

یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے — مرجائے ولے اُس کو یہ آزار نہ ہووے
زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مرجائے — پر دام محبت میں گرفتار نہ ہووے
اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد — یہ باؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے
مانگے ہے دعا دیکھ مجھے خلق یہ ظالم — یارب کسی کو اس سے سروکار نہ ہووے
صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر — یہ سیر سر کوچہ و بازار نہ ہووے
جو دے آرام ٹک آوارگی میر — تو شام غربت اک صبح وطن ہے

ولہ

عشق میں بے خوف و خطر چاہئے — جان کے دینے کو جگر چاہئے

باقلِ آغوشِ ستم دیدگاں — اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے
شرطِ سلیقہ ہے ہر اک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

وله
نہیں وسواس جی گنوانے کا — ہائے رے ذوق دل لگانے کا
دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھا بہانے کا

وله
اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
اُس کی شمشیرِ تیز ہے ہمدم — مر رہیں گے جو زندگانی ہے
یاں ہوئے میر ہم برابرِ خاک — واں وہی نازو سرگرانی ہے

وله
ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اُس کی — وے تصویر کھینچے گا یہ ہم نے مانی

وله
گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی — رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی

وله
کیا حال بیاں کریئے عجب طرح پڑی ہے — وہ طفل تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے
کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں — یہ گاڑی مری راہ میں بے طرح اڑی ہے
ہے چشمکِ انجم طرف اُس مہ کے اشارے — دیکھو تو مری آنکھ کہاں جاکے لڑی ہے
وہ دن گئے جو پہروں لگی رہتی تھیں آنکھیں — اب یہاں ہمیں مہلت کوئی پل کوئی گھڑی ہے
ایسا نہ ہوا ہوگا کوئی واقعہ آگے — اک خواہشِ دل ساتھ مرے جی کے کھڑی ہے
جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے — ہر تار نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

رباعی
اب عشق میں میر پاؤں دھرتا ہے گا — سب زیست منغص اپنی کرتا ہے گا
یارو چلو سب چل کے اُسے سمجھاویں — افسوس کہ نوجوان مرتا ہے گا

دیگر
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے — ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

دیگر
اب وقتِ عزیز کو جو یوں کھوؤ گے — پھر صبح کے غفلت کے تئیں روؤ گے
کیا خواب گراں یہ روز و شب مائل ہو — جاگو ٹک میر پھر بہت سوؤ گے

دل غم سے ہوا گداز سارا اللہ	دیگر	غیرت نے ہمیں عشق کی مارا اللہ	
ہے نسبت خاص تجھ سے ہر ایک تئیں		کہتے ہیں چنانچہ سب ہمارا اللہ	
تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے	دیگر	خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے	
اب آخر عمر میرزا کی خاطر		سجادہ گرد رکھنے نکالا ہم نے	

۲ مظہر

مظہر تخلص، میرزا مظہر جان جاناں کہ کے مشہور تھے مشہور سخنوروں میں دلی کے نظم و نثر ریختہ میں نہایت خوش بیان، اور اندازِ گفتگو میں نادر زبان تھے۔ اصل وطن ان کا اکبر آباد ہے، اور دلی ان کے نشو و نما کی بنیاد ہے۔ قناعت اور استغنائے طبیعت کے ساتھ مشہور، اور علم و عمل سے فقہ کے معمور تھے۔ حسن پرستی و دل بستگی سے رغبت تمام رکھتے تھے، اور عشق حقیقی و مجازی سے کام انعام اللہ خاں یقین اور فقیہ صاحب دردمند ان کے شاگردانِ رشید سے کہاتے ہیں، اور میر عبدالحی تاباں تخلص بھی علی ہذا القیاس اسی طرح سے گنے جاتے ہیں +

کہتے ہیں کہ ہفتم روز عاشورہ کو لب بام پہ اپنے گھر میں سرراہ بیٹھے تھے، اور کوئی سوداگر میلو کا بھی آیا ہوا تھا واسطے ان کی ملاقات کے۔ کہ ناگاہ گذر شیعوں کا ان کے زیر بام سے ہوا، اس گروہ نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی۔ اور موافقت سلام سے ہوا۔ اور میرزا ئے مذکور جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔ بلکہ متبسم ہو کے فرمانے لگے کہ "بارہ سو برس جس مقتدے کو ہو چکے ہوں ہر سال اُسے زیادہ کرنا کیا بدعت ہے، اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل کی خفت ہے": یہ گفتگو بجنسہ وہ لوگ جو کہ علم اور شیعوں کے ساتھ تھے انہوں نے سنی، اور تعصب کی مرزا ئے مذکور کے امام باڑوں میں اور محفلوں میں دو تین شب گفتگو رہی۔ آخر شب شہادت کو، کہ عبادت شب دہم عاشورہ ہے کوئی شخص ان کے دروازے پر آیا، اور ان کو باہر بلوایا جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ پہنچے کی نذر کی، اور کام ان کا پورا کر کے تلوہ راہ اپنے گھر کی لی۔ سن بھی ان کا قریب سو برس کے تھا، اور

ایسا زخم کاری کھایا، لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا۔ سنہ ۱۱۹۴ھ گیارہ سو چورانوے ہجری تھے کہ اس روشن ساز مسائل صدیقی نے، اور اُس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کے منازل کے طریقت پر کیا۔ یہ اشعار اُن کے نتائج افکار سے ہیں ؎

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا ؎	ولہ	اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
نہیں کچھ غم کہ یوں ملتا نہیں پیماں گسل میرا	ولہ	کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پر ہائے دل میرا
ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار	ولہ	ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو کیا ہے کام گلشن سے ولیک		جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں کہ آتی ہے بہار
مرتا ہوں میرزا سے گل ہر سحر	ولہ	سورج کے ہاتھ جوہری و صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کے تئیں مرے		یہ شیشہ بیچتا ہے کسی میرزا کے ہاتھ
خدا کے واسطے اُن کو نہ ٹوکو ؎	ولہ	یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں سبھے		ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

۳۔ مضموںؔ

مضموں تخلص، شیخ شرف الدین نام، متوطن باج مہو کے تھے۔ باج مؤ ایک قصبہ ہے قصبوں میں سے اکبر آباد کے۔ جس ایام میں کہ وطن سے اپنے یہ وارد شاہ جہان آباد میں ہوئے تھے، تو زینت المساجد میں آن کر اُترے تھے۔ طور ان کی بود و باش کا پھر وہیں رہا ہے۔ اور اتفاق اصلاح کا سراج الدین علی خاں آرزو سے ہوا ہے۔ ازبسکہ شیخ مذکور علت سے نزلہ کے منہ میں ایک دانت

لہ کسی نے کیا بے مثل تاریخ آپ کی وفات کی کہی ہے۔ عاش حمیدا مات شہیدا
لطف یہ ہے کہ یہ الفاظ حدیث نبوی کے ہیں ؎

نہیں دھرتے تھے، تو خان آرزو انہیں شاعر بیداد کہا کرتے تھے۔ دلّی میں نظمِ وجود کو انہوں نے ناموزون بوجھا ہے، اور مضمونِ عالی انہیں سیرِ وجود کا وہیں سوجھا ہے۔ بیشتر حسن ان کے کلام میں ایہام کا ہے۔ یہ منتخب ان کے کلام کا ہے ؎

افسوس مار جھٹ پٹ دل کو رکھے ہیں اٹکا		کس ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا
خوبوں کو جانتا تھا گرمی کریں گے مجھ سے	ولہ	دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا
نہیں ہے زاہدوں کو میرے ستی کام	ولہ	لکھا ہے اُن کی پیشانی میں سر کا
ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا	ولہ	صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا
کچے میں بیوفا کے مارے گئے ہیں عاشق	ولہ	نکلا ہے ایک مضموں بھاگوں سے اپنے جینا
ترا مکھ ہے سرچشمۂ آفتاب	ولہ	نہ لاوے تری حسن کی ماہتاب
جس طرح سے رہے ہے مال کے اوپر کالا	ولہ	یوں رہو زلف تری مُنہ کے اجیارے کے بیچ
اگر یہی دار ہے کامل کو سر تاج	ولہ	ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج
ایک تو تھا ہی وہ مہ رو خود پسند	ولہ	ہو گیا آرسی کے تئیں دیکھ دو چند
تجھ بن زبس کہ پانی جاری کئے ہیں دکر	ولہ	چشموں سے میں اب اپنے بیٹھا ہوں ہاتھ دھو کر
تیر مژگاں بہتے ہیں مجھ پر	ولہ	آب پیکاں کا اس طرف سے ڈھال
کیفی ہو کر جو مجھ سے رہا ہے وہ شوخ	ولہ	جو پوچھتا ہوں بات تو کہتا ہے چل بچل
احوال میں پیش دلبر کچھ مت کہو ہمارا	ولہ	آتا ہے نام میرا سُن کر اُسے پسینا
شرم سے پانی ہو جاویں سخت سب	ولہ	جو ملا یوسف ملے آ چاہ سے
وہی دلدار خوش آتا ہے جو ہووے بانکا	ولہ	خوب لگتی نہیں وہ تیغ جو خمدار نہیں
کیا ہوا جو خط مرا پڑھتا نہیں	ولہ	جانتا ہے خوب وہ مضمون کو
اُس دہاں بیچ سخن رکھتا ہوں	ولہ	مجھ پہ اس بات کو اثبات کرو
جب سے چاہا ہے ترا چاہِ ذقن	ولہ	آب چشموں سے مرے جاری ہے

نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں
گذرتا ہے مجھے یہ چاند خالی

ولہ

چلا کشتی میں جب آگے سی وہ محبوب جاتا ہی
کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے
یہ اشک آنکھوں میں تا معد کس طرح یک دم نہیں تھمتا
دلِ بیتاب کا شاید لئے مکتوب جاتا ہے

ولہ

مرے آئینۂ دل سے ترا نقش
جو دیکھا تو کسی صورت نہ جاوے

ولہ

مضمون تو شکر کر کہ ترا نام سُن رقیب
غصے سے بت سا ہو گیا لیکن جلا تو ہے

بہ مخلص

مخلص تخلص، مخلص علی خاں نام، بھانجے نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے، ساکن مرشد آباد۔ میر باقر کرکے مشہور تھے۔ جوان خندہ رو اور کشادہ پیشانی، ہمیشہ خوش وقت اور خوش زندگانی بنگلے میں بہت کیفیت کے ساتھ انہوں نے گذری ہے، اوقات بیشتر عیش و کامرانی میں بسر کی ہے، شب و روز عیش و عشرت سے کام تھا، اور رات دن وقفِ احباب گردنِ صراحی اور لبِ جام تھا۔ زبان ریختہ میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ چنانچہ دیوان بطور اساتذہ ترتیب بھی دیا ہے لیکن کثرتِ عیش سے از بسکہ دھیان دھا کہیں کا کہیں ہے، کلام ان کا خالی لغزش سے نہیں ہے۔ شاید ۱۲۰۷ھ بارہ سو سات ہجری میں بلدۂ مذکور کے اندر دامِ ہستی کی کشاکش سے رہائی پائی ہے، اور سیر چمنستانِ عدم کی عینِ تعیش میں فرمائی ہے۔ یہ اشعار اس ستودہ کردار کے ہیں ۔

مد بسم اللہ ابرو ہے رخِ عنوان کا
حسنِ معنی کیوں نہ مفتوں ہو مرے دیوان کا

ولہ

اب ٹک تو اس کو آ کے جفا کار دیکھنا
مرتا ہے کوئی دم میں گرفتار دیکھنا

ولہ

ہمارے قتل کرنے سے تجھے آرام کیا ہوگا
میاں اس ظلم کا تو ہی سمجھ انجام کیا ہوگا
بدی میں یاں تلک مشہورِ دنیا ہے مرا مخلص
پھر اُس بدنام سے آگے کوئی بدنام کیا ہوگا

ولہ

ہاتھ ملتا ہے کہ میرے دل کے ہوتے حیف ہے
کیوں کفِ پا ہیں ترے رنگِ حنا سے آشنا

یہ پوچھو خضر اسمٰعیل سے گر تم نہیں واقف	وله	حیاتِ جاوداں بہتر ہے یا سر کو فدا کرنا
ترکِ اُلفت یہ بتوں کی مجھے مقدور نہ تھا	وله	ورنہ کعبہ مرے بت خانہ سے کچھ دور نہ تھا
مخلص کیا دریافت یہ میں سنگ محک سے	وله	جو عیب کسی کا کہے منہ اُس کا ہو کالا
آخر یہ دل ہمارا کچھ داد کو نہ پہنچا	وله	جز نالہ کوئی اُس کی فریاد کو نہ پہنچا
ہو گئے داغ نمکداں مرے ای کان نمک	وله	جب ستی لب کا ترے شور پڑا کان میں آ
اگر یاد کر بوسے لب کو ترے	وله	نہ ہو مست کو یہ خمار شراب
زخمِ دل سینے کو کہتا ہے مرے کام آتا	وله	باقی رہتا جو کوئی تار گریبان کے بیچ
گئے یہ بال و پر برباد صیاد	وله	قفس سے اب نہ کر آزاد صیاد
دیکھیے کس نہیں پھولی یہ باغ و دشت میں	وله	دور سے آنکھیں خزاں کی تئیں دکھاتی ہے بہا
دل خستہ وسوادزدہ تدبیر سے ہے نازک	وله	دیوانہ زبردست اور زنجیر سے نازک
محبت میں تری جا کر پھنسا دل	وله	دریغا ہائے دل واحسرتا دل
تھی یہ خوشی کہ ہوگا مرے دل کا غم تمام	وله	وہ تو ہوا نہ کم پہ ہوئے ہای ہم تمام
کیوں محبت میں علاج داغ کر دل	وله	خانۂ دل کو بے چراغ کر دل
کیوں نہ ہر دم مری آنکھوں سے چوے ہائے لہو	وله	داغ ایسا نہیں کوئی دل میں کہ ناسور نہیں
منظور بندگی مری ہو تجھ کو گو نہیں	وله	میں دست کش ہوں تجھ سے یہ ہوتا ہی تو نہیں
ملی جب خواب سے اُٹھ آنکھ تو تے صحنِ گلشن میں	وله	شگفتہ ہو گئیں گلزار میں نرگس کی سب کلیاں
کیوں کیا جھاڑ کے نوبت غبار دامن	وله	کچھ نہ اتنا تھا میاں وہ ترا بلید دامن
نہ لی آخر خبر اس نیم بسمل کی کبھو تو نے	وله	تجھے صد آفریں صیاد یوں ہی صید کرتے ہیں
جن کو دولت سے شہادت کی تمنا مخلص	وله	تیغ بیداد کو وہ بال ہما کہتے ہیں
گرم جوشی ستی مخلص سے ملے ہے جب یار	وله	رشک سے اُس کے رقیبوں کے جگر جلتے ہیں
ستم سے ترے آشنا کم رہے ہیں	وله	ہمیں ہیں کہ اب تک کہ یہاں تم رہے ہیں

کہتے تو ہو ملنے کی آتی ہیں ہمیں گھاتیں ‏ وله ‏ جھوٹے ہو میاں تم تو کہنے کی ہیں یہ باتیں

روتے روتے جو کبھی ہوش میں آجاتا ہوں ‏ وله ‏ شرم سے اپنے میں جیسے کہ مرا جاتا ہوں

اُس کے یہ ظلم و ستم کچھ نہ کہے جاتے ہیں ‏ وله ‏ نہ ہمیں چھوڑتے بنے ہے نہ سہے جاتے ہیں

کہتا ہے تو جو ہر دم شمشیر سے ادیں ہوں ‏ وله ‏ یہ لطف ہے اور سر ہے تقصیر وار میں ہوں

مخلص ترے کے یار بہت ہیں گے مشتری ‏ وله ‏ تم بھی اگر ہو اُس کے خریدار کچھ کہو

آئینہ رو کے دل میں کوئی راہ کیا کرے ‏ وله ‏ دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کرے

عاشق سوائے رونے کے اور کام کیا کرے ‏ وله ‏ جس کا جلا ہو دل سو وہ آرام کیا کرے

قاصد کو دیکھ دور سے دیتا ہے گالیاں ‏ وله ‏ ایسی پری کو پھر کوئی پیغام کیا کرے

مرے دل میں آن بسا آکے تو ہے ‏ وله ‏ کہ مجھ کو پڑی اپنی اب جستجو ہے

ڈرتا ہوں محبت مری اظہار نہ ہووے ‏ وله ‏ مجھ سے کہیں آزردہ وہ دلدار نہ ہووے

دل کو مرے ہرگز کبھی آرام نہ ہووے ‏ آغوش میں میرے جو دل آرام نہ ہووے

یہ دشت خاک اُڑ جاتی ہے جب ملنے کو مجنوں سے ‏ وله ‏ بگولے تگے آتے ہیں اُسے لینے کو ہاموں سے

کیوں کر ہووے گی زندگی اب آہ ‏ وله ‏ دل کی نوبت تو جان پر آئی

نہیں یک دل سلامت اس میں پایا ‏ وله ‏ شکن اُس زلف کی کیا دل شکن ہے

چمن میں قد نے ترے طرح جلوہ جب ڈالی ‏ وله ‏ نہال و گل نے کہا مد ظلہ العالی

ڈرتے ہو دامن آہ کے شعلے سے جل نہ جائے ‏ وله ‏ عاشق کی خاک پر نہیں آتے ہیاں کبھی

کوئی اپنے اسیروں سے تغافل یوں بھی کرتا ہے ‏ وله ‏ قفس میں مر گئے ہم یہ خبر صیاد کو پہنچے

سحر روتے لہو اور کرتے شام آہ بسا گذری ‏ وله ‏ کبھی تو نے نہ پوچھا آہ مخلص پہ کیا گذری

مخلص سا وفادار کوئی ہم نے نہ دیکھا ‏ وله ‏ اس طور کا بندہ نہیں ہوتا ہے خدا سے

رہتا ہے غضب مجھ پہ تو ہر شام و پگاہ ‏ رباعی ‏ کرتا ہے تو ثابت مری گردن پہ گناہ

تجھے نہیں اتنی بھی ظالم درکار ‏ مطلوب اگر سر ہے مرا بسم اللہ

تا مجھ میں عجب دیکھی مروت تیری	باہم	عاشق کے ستانے میں ہے رغبت تیری
دل غم سے نہیں بھرا ہے اتنا میرا		جو اس میں سماوے یہ نصیحت تیری

۵- مجذوب

مجذوب تخلص، میر غلام حیدر نام۔ شاہجہان آبادی۔ بیٹا سر تاج شعرائے بلند مقام میر تقی سودا شاعر شیریں کلام کا ہے۔ آشنا پرستی اور یک رنگی کے ساتھ موصوف، درد دل اور گداز طبیعت میں مشہور و معروف۔ نظم ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، اور حسن ترکیب میں تا بہ مقدور رنگیں بیان۔ تلاش سے معنی تلذذ کے حتی الامکان نہیں گذرتے ہیں، اور باندھنے سے مضامین مشہور کے حتی المقدور کنارہ کرتے ہیں دو دیوان جواب میں میر تقی میر کے انہوں نے کہے، اور مقدور بھر سرانجام جواب سے غافل نہیں ہے غرض بالفعل، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ساتھ عسرت معاش کے لکھنؤ میں جیتے ہیں مصرع

لخت دل کھاتے ہیں اور خون جگر پیتے ہیں ٭ یہ منتخب افکار اس ستودہ اطوار کا ہے ٭

خوباں سے جو دل ملا کرے گا		وہ ٹر کا ہے یہی کہ کیا کرے گا
عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں	ولہ	بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی		تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں
آوے ہے مسیحا مرے بالیں پہ تو کیا ہو	ولہ	بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو
اشک آنکھ میں ہو عشق سے تا دل میں غم رہے	ولہ	یہ گھر ہے وہ خراب کہ آتش میں نم رہے
چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر		صیاد نے سنا یہ ترانا تو ہم رہے

۶- مصحفی

مصحفی تخلص، غلام ہمدانی نام، ساکن امروہے کا۔ اپنی قوم کا اشراف ہے، سچ تو یہ ہے کہ گفتگو اس کی بہت صاف صاف ہے۔ بندش نظم میں اس کے ایک صفائی اور شیرینی ہے، اور معنی

بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی۔ ایک مدت شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت میں مقیم شاہ جہان آباد کا رہا ہے۔ بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک چودہ برس سے لکھنؤ میں بسر کرتا ہے مضیقِ معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیبِ اہلِ کمال ہے، اسی طور پر درہم برہم اُس غریب کا بھی احوال ہے۔ دیوان اس عزیز کا بھرا ہوا نظم کے جمیع اقسام سے ہے۔ یہ اس کے منتخب کلام سے ہے ✦

پیری میں اور بھی ہوئے غافل ہزار حیف
بے اختیار لے گئی ہم کو یہ خوابِ صبح

وله
ہوئی ہے بسکہ یہ فصلِ بہار دامن گیر
چلیں چمن سے تو ہوتا ہے خار دامنگیر
بچو کے رکھیو قدم دل جلوں کی تربت پر
مبادا ہو کوئی تیرا شرار دامنگیر

وله
آگیا خط پہ سرِ مو نہ گیا ناز ہنوز
ہے اسی ڈھب پہ نگاہِ غلط انداز ہنوز

وله
ایک دن رو کے نکالی تھی وہاں کلفتِ دل
اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ

وله
زبس آئینہ رو ہے طفل حجام
نہیں بن دیکھے اُس کے دل کو آرام

وله
جو دیکھیں انگلیاں وہ گورے گوری
بنا خورشید پانی کی کٹوری
وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا
اُسے حیرت نے آئینہ دکھایا
ملا جب آئینہ کو جیسا نائی
بنائی چار ابرو کی صفائی
نہ کھینچے نامہ مو اُس کی تمثال
کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال
سنے ہی مصحفی اب تو بھی فی الحال
منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

۷۔ محبّت

محبّت تخلص، نواب محبت خاں نام خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ہیں حسب و نسب کی طرف سے کثرت شہرت کے باعث نہیں محتاج بیان کے ہیں۔ جوان خوش ظاہر و خوش رو ہیں، اور خوش اختلاط و خوش خو حُسن خلق سے معمور، اور مروت و جوانمردی کے ساتھ

مشہور۔ فقط خوش مزاجی خلقی کے باعث انہوں نے شیوہ سخنوری کا اختیار کیا، اور خوش استعدادی طبعی کے سبب طبع یگانہ کے تئیں لطافت معنی سے یار کیا۔ جمیع اقسام نظم میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے، اور اصلاح سخن کی میرزا جعفر علی حسرت تخلص سے لی ہے۔ معاصرین اپنے میں مشہور ہیں ساتھ خوش بیانی کے، اور روشن طبیعتوں میں شہرت رکھتے ہیں ساتھ روشن زبانی کے۔ قصہ سسی پنوں کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مستر جانسین بہادر کے انہوں نے نظم کیا ہے۔ اور نام اس مثنوی کا اسرارِ محبت رکھا ہے۔ بعد نواب حافظ رحمت خاں کی شکست کے، جو لکھنؤ میں آئے، تو اسی ایام سے بس طرح بود و باش کی وہیں ٹھہرائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت اعزاز و اکرام کیا تھا، اور مشاہرہ بھی معقول کر دیا تھا۔ بالفعل، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اسی شہر میں بود و باش رکھتے ہیں، اور مضامینِ تازہ کی ہمیشہ تلاش رکھتے ہیں۔ دیوان میں ان کے نظم کے سب اقسام ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب کلام ہیں +

جب تلک وہ بت خود کام نہیں آنے کا		دلِ بیتاب کو آرام نہیں آنے کا
مجھ کو خطرہ ہے خدایا یہ نہ کرے جو اس کا		ہووے تو سمجھیں پیغام نہیں آنے کا
کیا خوشی کیجئے یاں رو کہ وہ خورشید لقا		صبح آوے گا تو پھر شام نہیں آنے کا
کوئی ڈھب بھی تجھے آتا ہے وفاداری کا	وله	یا کہ سیکھا ہے یہی شیوہ ستمگاری کا
دیکھا اک جھڑکی میں اے یار کوئی بھی ٹھہرا		کیا ہی اغیار کو دعویٰ تھا تری یاری کا
قید ہو بیٹھے ہوا دونوں جہاں سے آزاد	وله	میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا
دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا ٹک	وله	میرا غبار کیجو برباد اس طرح کا
مذکور جو محفل میں ہوا دوش کسی کا	وله	سنتے ہی ٹھکانا نہ رہا ہوش کسی کا
شب کہ مجلس بیچ وہ غارت گر ہر خانہ تھا	وله	تھے جو باہم آشنا ایک ایک سے بیگانہ تھا
بس گھڑی گھر دوسرے تو جلوہ فرمانے لگا	وله	غنچۂ تصویر بھی خجلت سے مرجھانے لگا
یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ تا صبح دل ہوا		تھا مرا ہمدرد لیکن مجھ کو سمجھانے لگا

ولہ عاشقوں میں بھی مجھے لکھا تو نے — آج چہرا مرا بحال ہوا
ولہ تیری گلی سے دل افگار جو گیا سو گیا — عدم کے کوچہ سے اے یار جو گیا سو گیا
تو اس کے گھر کو تو ہنستا ہوا چلا اے دل — یہ ہے وہ قہقہہ دیوار جو گیا سو گیا
ولہ دل جو جاتا ہے چلا جائے کہیں مجھ کو کیا — اس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھ کو کیا
چشم حیراں سے کہاں دل کو ملے لذت دید — مری آنکھیں جو تجھے دیکھ رہیں مجھ کو کیا
منزل اوّل ہی ابھی عشق کی اے تاب و تواں — چھوڑ جاتے ہو تم افسوس نہیں مجھ کو کیا
ولہ دل دیں گے رونمائی دستور ہے ہمارا — کیا کیجیے یہی کچھ مقدور ہے ہمارا
اللہ رے تکبر سنتا نہیں سخن بھی — یہاں تک وہ بت غیور مغرور ہے ہمارا
جاتے ہیں جلد پھینکے توسن کو گھر کے ہم — کیا کیجیے محبت گھر دور ہے ہمارا
ولہ غیر کو یاد تو زنہار نہ رکھ اے پیارے — بھول جا مجھ کو بھی لیکن یہ مری بات نہ بھول
ولہ دید زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں — اڑتا ہے اپنا مرغ نگہ آشیانے میں
دل خشک ہے کہاں سے بہیں اشک چشم سے — فوارہ تب چھٹے جو ہو پانی خزانے میں
ولہ نزع میں دم ترے پاس آنے کا ہم رکھتے ہیں — دم میں دم جب تلک اپنے ہے یہ دم رکھتے ہیں
آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتی ہیں — یہ جو جھوٹ ہووے تو ہم ہات قلم کرتے ہیں
ولہ سرخیِ اشک کبھی اور کبھی زردیِ رو — تو نے اے عشق عجب رنگ دکھایا مجھ کو
ولہ بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنی جو مجھے — تو اٹھا لیجیو اے بار خدایا مجھ کو
ولہ ساقی گھٹا ہیں جو برستی نظر پڑی — یاد آئی مے وہیں وہیں مستی نظر پڑی
بوسے کی بھی عوض نہ خریدی یہ جنس ہائے — اس کو متاعِ دل مری سستی نظر پڑی
یا تھا فلک پہ اس کا دماغ اب ہے خاک پر — دل کی عجب بلندی و پستی نظر پڑی
ولہ تمنا یہ ہے ہیہات کہنے میں نہیں آتی — غرض یہ کیا کہوں کچھ بات کہنے میں نہیں آتی

مخمس

کون سے روز میں سرِ سنگ سے مارا نہ کیا
پر مرض کا مرے تو نے کبھی چارا نہ کیا
ہجر میں تیرے میں کب جیب کو پارا نہ کیا
دردِ دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا
نہ کیا میری طرف تو نے گذارا نہ کیا

یوں ہی آ نکلے تھے محفل میں تمہارے ہم تو
مر گئے ہائے اسی رشک کے مارے ہم تو
آپ کے دیکھ چکے سب یہ اشارے ہم تو
آ لگے گور کے اس غم سے کنارے ہم تو
تو بھی غیروں سے میاں تم نے کنارا نہ کیا

ساری شب رہتی ہے مجھ میں اور دلبر میں خوشی
لیک حرفِ نازِ اس کا سُن نہیں رہتی جی میں جی
اگر اُسے میں جام بھر بھر دوں پہل وہ مجھ کو کبھی
پھیرتا ہوں جب میں اُس کو تب یہ کہتا ہے ابھی
باس سے ہم تیرے ان باتوں سے اب اُٹھ جائینگے

مثنوی

کہی القصہ پھر بندے سے یہ بات
اگر ضائع نہ ہووے اس میں اوقات

مضموں کرکے اس قصہ کا معلوم
یہ ہی منشا رکر تو اس کو منظوم

یہ بات اسی لئے تجھ سے کہی ہے
کہ مشق اس کی بہت تم کو رہی ہے

تجھے اس عشق کے ہیں کا معلوم
محبت کے ہیں سب اسرار معلوم

پیا ہے تو نے بھی جام محبت
سراپا تو ہے ہم نام محبت

ترے اشعار سن کر سب سخنداں
محبت کا اُسے کہتے ہیں دیواں

سراپا کیا لکھوں اُس شمع رو کا
کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا

عیاں یوں ہوئے سر تھے عنبر آلود
کہ جیسے شمع کے شعلہ پہ ہو دود

دوپٹا چاند تارے کا زری باف
جو اوڑھے تھی کرانی بیاں صاف

سما ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر
شبِ دیجور میں چمکے ہیں اختر

گندھی چوٹی تصور اس شکل آوے
کہ جوں مارِ سیہ لہریں دکھاوے

بہت سے تھا دلوں کا اس میں مسکن
اچنبا ہے کہ اک سانپ اور کئی من

نگہ بد بفلک کی اُس جبیں پر
اک ابرِ سیہ جیسے ہو مُنہ پر

دو دندان آبدار اس سیم بر کے
کہ سوراخ اُن سے ہیں دل میں گہر کے

کروں کیا خوبیِ لب کی میں تقریر
قیامت اُس پہ تھی مسّی کی تحریر

تبسم میں نظر اس رنگ سے آئے
کہ غنچہ جیسے نافرماں کا کھل جائے

زباں کھولوں اگر وصفِ دہاں پر
سخن ہو جائے گم میری زباں پر

گو شکیا کیا جھکا دے عشق اُس آہ
جسے چاہِ زنخ کی اُس کے ہو چاہ

نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی
وہ ہے گویا صراحی دار موتی

حنا سے سرخ تھا یوں پنجۂ ماہ
کہ جوں خوش خط لکھیں سُرخی سے اللہ

بھلا دوں کس سے نسبت ان کچوں کو
جو میداں حُسن کے سے لے گئی گو

عیاں وہ گلشنِ خوبی میں ہیں یوں
کہ جیسے دو انار اک شاخ میں ہوں

اگر دیکھے اُنھیں نامردِ ذاتی
عجب کیا وہ بھی اپنی کوٹے چھاتی

جو وصف اُس ساقِ سیمیں کا سنے پھر
بحسرت شمع رو رو سر دھنے ہے

قدِ موزوں وہ جب اپنا دکھا جائے
اور اُس کے فندقِ پا تک نظر آئے

تو حیرت سے ہوں یہ سب کو چہ دیکھے
بنِ شمشاد میں غنچے نہ دیکھے

جھنک خلخال کی تھی کیا قیامت
کہ ہر سو جس سے برپا تھی قیامت

جو ہو ٹک فرشِ گل پر گرم رفتار
رگِ گُل پشتِ پا سے ہو نمودار

۸۔ منت

منت تخلص، میر قمرالدین نام، شاہ جہان آبادی، سلسلہ ان کے نسب کا ماں کی طرف سے سید جلال بخاری کو پہنچتا ہے۔ وہ سید جلال جو بیٹے تھے سید مقصد یزدی کے جن کا احوال مفصل تذکرہ کاشی میں لکھا ہے۔ قرابتوں کی تقریب اور پیوندوں کے سبب سے تربیت منت مذکور نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے گھرانے میں پائی ہے، اور کیفیت راہ طریقت و معرفت کی فخر العارفین مولوی فخرالدین قدس سرہٗ کی خدمت سے اٹھائی ہے۔ عقدے فن شعر و شاعری کے میر شمس الدین فقیر تخلص کی فیض صحبت سے ان پر کھلے، اور میر نورالدین نوید تخلص کی برکت مجالست سے دقیقے مستی و چستی تکلم کے ہوئے۔ صفائی بندش و حُسنِ بیان میں فی الحقیقت اُستاد، اور موشگافی معنی میں قلم اس کا رشکِ خامۂ بہزاد۔ زبان فارسی میں کلکِ عنبر سلک نے ان کے بہت کچھ لکھا ہے۔ نظم و نثر ملا کے قریب لاکھ بیت کے کلیات ان کا ہے۔ مثنویاں متعدد انہوں نے کہیں، اور کتابیں بیشتر تالیف کیں۔ چنانچہ شکرستاں کر کے ایک نسخہ اس طرز پر مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے، اور جواب اگر گلستاں کا کہیں تو کیا مقدور ہے۔ سنہ ۱۱۹۱ گیارہ سو اکانوے ہجری میں ویرانیٔ شاہ جہان آباد کے باعث لکھنؤ میں ان کا آنا ہوا، اور میر محمد حسین فرنگی لقب کی بار فروشی کی سبب مشتاق ان کا وہاں ایک زمانہ ہوا۔ بعد چندے مربی گری سے میر مذکور کے ممتاز الدولہ مسٹر جانسٹن بہادر کی سرکار میں توسل انہوں نے حاصل کیا، اور رفاقت میں صاحب مذکور کی کلکتے تک عماد الدولہ گورنر مسٹر ہسٹنگ جلادت جنگ بہادر کی اعانت کے باعث پیشگاہ نظامت سے صوبہ بنگ کے خطاب ملک الشعرا کا لیا۔ بعد ایک مدت کے رفیق بہ مہاراجہ ٹکیت رائے کے ہوئے، اور چند ایام زندگی کے اپنے طور پر بسر کئے۔ سنہ ۱۲۰۶ بارہ سو چھ ہجری میں نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں بہادر اور مہاراجہ ٹکیت رائے واسطے کچھ سوال و جواب معاملات کے لکھنؤ سے کلکتے جو تشریف لائے، تو میر قمرالدین منت بھی ساتھ آئے۔ ایک تین چار روز تپ محرق ان کو عارض ہوئی، اور بغیر جان کے لئے وہ تپ نہ گئی۔ چنانچہ کلکتہ اس سید غریب الدیار کا مدفن ہوا۔

اور تا رستخیزِ قیامت وہی مسکن ہوا۔ یہ خلاصۂ افکار اس منتخب روزگار کا ہے +

خشک نالے ہو گئے بہنے سے دریا تم رہا | چشم میں اپنے نہیں اک عمر سے کچھ نم رہا
مے کدہ سے ٹل گئے اہلِ ہوس پی پی کر جام | انکھیں وہ ہوں کہ اس پیر مغاں میں جم رہا

ولہ
کوتہ ہے اس کی زلف سے دستِ صبا ہنوز | عقدہ ہوا یہ دل کا ہمارے نہ وا ہنوز

ولہ
گل نکلتے ہیں زمیں سے یہ برنگِ شعلہ | کون دل سوختہ جلتا ہے تہ خاک ہنوز

ولہ
گر نقشِ دوئی مٹائیں گے ہم | سچ کہیو کہ کیا کمائیں گے ہم
مصری سے وہ ہونٹ تک دکھاوے | کچھ گھول کے پی نہ جائیں گے ہم
اس آنے کا کچھ بھی لطف پیارے | ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم
آئینۂ دل جو تھا وہ ٹوٹا | کیا اب تمہیں منہ دکھائیں گے ہم

ولہ
سو کوہِ آتشیں کو چھاتی سے پیلتے ہیں | کچھ عاشقی نہیں ہے ہم جی پہ کھیلتے ہیں
دل ہم ستم زدوں کا ہے واجب الترحم | اس نیم قطرہ خوں پر سو زخم جھیلتے ہیں
خوانِ کرم پہ تیرے ہے سیر ایک عالم | ہم بے نصیب اب تک پاپڑ ہی بیلتے ہیں

ولہ
منت ایسے کو دل دیا تو نے | اے مری جان کیا کیا تو نے

ولہ
مدعی اس سے سخن ساز بہ سالوسی ہے | پھر تمنا کو یہاں مژدۂ پابوسی ہے
ہے مری طرح جگر خون ترا مدت سے | اے حنا کس کی تجھے خواہش پابوسی ہے
تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھ پر منت | ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خو سی ہے

ولہ
کوئی اس بدمزاجی پر تمہارے پاس کیا بیٹھے | ادھر ٹک ہم نے دم مارا ادھر تم منہ بنا بیٹھے
یہیں سے ہمرہانِ قافلہ اپنی تو رخصت ہے | کہ اس وادی میں ہم تو ضعف سے جوں نقشِ پا بیٹھے

قطعہ
کھڑے رہتے جو اس کی بزم میں تو یوں لگو کہنے | دکھاتا ہے یہ اپنے پاؤں کیوں ناحق کمر کو بیٹھو
جو اتنی بات سن کر بیٹھ جاویں تو لگے کہنے | ہنسی سے کہتے ہی اک بات کے بس آپ بیٹھو
دوا مے بازیہ بندہ تو منت بد کھلانے سے | تکلف برطرف گر ساتھ اس بت کے خدا بیٹھے

کہاں ہم کو خوش غم دل رو ہے ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ گرہ زیر لب غنچۂ آرزو ہے
قدم رکھ گیا کون سینہ پا سپنے ۔۔۔ گل داغ میں آج مہندی کی بو ہے
سُنا تا تھا میں حال دل اُس کو منت ۔۔۔ کہا چل بے یہاں سے یہ کیا گفتگو ہے

آہو سے تری چشم کی کب چھوڑیں یہ تشبیہ ۔۔۔ جب تک کسی ساغر کو تو آنکھیں نہ دکھاوے
اُٹھ جائے کسی کے جو دل صاف سے پردا ۔۔۔ پھر آئینہ دنیا میں کبھو مُنہ نہ دکھاوے
بندے کو خدا کے نہیں جز دل شکنی کام ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ کیا سنگ سے دل شیخ کا اللہ بچاوے

منت یک بار عشق سے توبہ کر ۔۔۔ رباعی ۔۔۔ چار و ناچار عشق سے توبہ کر
اب تک مردود دین و دنیا رہنا ۔۔۔ آجانے دے یار عشق سے توبہ کر
منت جوں شمع دل جلا جاتا ہے ۔۔۔ دیگر ۔۔۔ رو کا کب غم کا ولولا جاتا ہے
کیا جانئے کیا خلش ہے سینہ میں آج ۔۔۔ ہر سانس کے ساتھ جی چلا جاتا ہے
منت ای جان ان بتوں کو مت پوچ ۔۔۔ دیگر ۔۔۔ مت کھو ایمان ان بتوں کو مت پوچ
ان باتوں پر پتھر پڑیں تیری ظالم ۔۔۔ اللہ کو مان ان بتوں کو مت پوچ

باب النون

۱- ناجی

ناجی تخلص، نام اس کا محمد شاکر تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ شاہ نجم الدین آبرو تخلص کا معاصر تھا محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے وقت میں اس نے شہرت پائی ہے، اور بطور قدما کے طرز ابہام میں کرتا طبع آزمائی ہے۔ خوش طبعی او ظرافت سے بیشتر سروکار رکھتا تھا، اور عالم کی ہجو کرنا شعار رکھتا تھا۔ شیوۂ قدیم میں صاحب دیوان ہے۔ اور وضع سابق میں شاعر خوش بیان ہے لیکن ازبسکہ غیر مروج طرز ابہام ہے، کلام ان کا نامقبول طبائع خاص و عام ہے۔ یہ منتخب اوراق اُس کہنہ مشاق کا ہے۔

قوس قزح سے چرچا کرتا ہے تجھ بھوان کا ۔۔۔ شاید کہ سر پھرا ہے اب پھر کر آسمان کا

نہ پوچھو خوبرو یاں عارض خورشید کی خوبی
ولہ
لیا ہے داد حسن ماہ مہ رویوں نے گرچندہ

مجھ کو باتوں میں لگا معلوم نہیں کیا کیا کیا
ولہ
لے چلا جی کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا

تری نگاہ کی کثرت سے اے کمان ابرو
ولہ
ہمارے سینہ میں تودا ہوا ہے تیر دل کا

مت گرفتار ہو دام زلف سے دل
ولہ
بال باندھا غلام ہے تیرا

سخن سن اس بت کافر ادا کا
ولہ
بچا ہوگا کوئی بندہ خدا کا

رنگ تیرا گندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف
ولہ
ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں اپنی خورد و خواب

دی ہے دریا اوپر مجھے بھجتی
ولہ
لا اتارا ہے میں اسے کس گھات

محبت سوں علیؑ کی دیکھ ناجی
ولہ
ہوا ہے دل مرا اب حیدر آباد

یکبار جو بغل میں لوں اس سرو قد کے تئیں
ولہ
بالا بتاؤں خضر کی عمر ابد کے تئیں

عاشق کو روتے دیکھ چڑھا مت بھواں کے تئیں
ولہ
برسات میں اتار رکھے ہیں کماں کے تئیں

زلف کیوں کھولتے ہو دن کو صنم
ولہ
مکھ دکھایا ہے تو مت رات کرو

ہے غرض ملنے میں نہ الفت کچھ اس بے درد کو
ولہ
پوچھتا ہے کان زر عاشق کے رنگ زرد کو

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ
ولہ
پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے
ولہ
یہ تو طالب زر کے ہیں اور یہاں خدا کا نام ہے

وظیفہ راگنی کے سر میں زاہد کفر ہے مت پڑھ
ولہ
نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہے

ہوا جب آئینہ میں جلوہ گر میں تب لیا بوسا
ولہ
جو آیا اپنے قابو میں تو پھر منہ دیکھنا کیا ہے

انا الحق بولنے لگتا ہے اس کے زخم کا بسمل
ولہ
کٹاری آبدار اس شوخ کی منصور خانی ہے

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
ولہ
عارضی میری زندگانی ہے

تصور سے ترے رخ کے گئی ہے نیند آنکھوں سے
ولہ
مقابل جس کے ہو خورشید کیونکر اس کو خواب آئے

۲- نعیم

نعیم تخلص، نعیم اللہ نام۔ یہ وطن شاہجہان آباد کا معاصر محمد حاتم حاتم تخلص کا تھا۔ چنانچہ اکثر شاعروں میں گفتگوئیں طنز و ایما کی ان کے درمیان آئی ہیں، اور مکرر غزلیں انہوں نے باہم لڑائی ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی، اور مطلع میں غزل کے طنز محمد نعیم پر کی ؎

جس دن سے کہ شے یار کا حاتم مقیم ہو
بد تر اسے خزاں سے بہار نعیم ہے

جب دور پڑھنے کا محمد نعیم تک پہنچا تو انھوں نے بھی مطلع غزل یہ پڑھا ؎

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے
لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے

غرض نعیم مذکور نے مرتے دم تک دلی نہ چھوڑی، اور شاہجہان آباد ہی میں سیر جنت النعیم کی کی۔ ایک دیوان مختصر زبانِ ریختہ میں اُس کہن اُستاد سے ہے۔ یہ اُس کے طبع زاد سے ہے +

اس وقت تک اے یار و گفتار نہ کیجے گا
اُس فتنۂ عالم کو بیدار نہ کیجے گا

احوال سراسر اُس کے کہنے لگا وہ ظالم
اب چاہئے بس زیادہ تکرار نہ کیجے گا

ولہ

خیال کر کے ترے مو کمر کو روتا ہوں
وہ کیوں نہ رووے پڑے جس کے بال آنکھوں میں

ولہ

دیکھ آئینہ خانے میں گر تجھ کو نہیں باور
تجھ سے تو جہان میں بھی دلدار بہت ہوں گے

بابُ الواو

۱- ولی

ولی تخلص، شاہ ولی اللہ نام، دکھنی۔ وطن بزرگوں کا اس کے گجرات ہے۔ شاعر بلند مقام تھا۔ اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز نے جمع کیا ہے۔ اور نظم ریختہ کو سرزمین دکھن میں رواج اس نے دیا ہے۔ شعراء دکن میں مشہور و ممتاز ہے، اور اپنے معاصروں میں سربلند اور سرفراز۔ عالمگیر بادشاہ کی سلطنت میں ہندوستان کی طرف آیا، اور میاں گلشن کے فیض خدمت سے فائدہ انواع

واقسام کا اُٹھایا۔ خوب خوب داد تلاش معنی کی دی، آخر اس بیتِ بے معنی وجود سے راہ کاشانۂ عدم کی لی۔ یہ اشعار اُس سربلند افکار کے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں ✦

پھر میری خبر لینے کو صیاد نہ آیا — شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا

ولہ

بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں — کام ہے تجھ چہرۂ گل نار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

ولہ

گذر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا — ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا

ولہ

صحنِ گلشن میں جب خرام کیا — سروِ آزاد کو غلام کیا

ولہ

پھرتے ہیں سیہ مست ہو شمشیر نظر لے — بن بندان انکوں کو پکڑ کون سکے گا
ہے نقش کناری کا ترے جامہ کے اوپر — دامن کو ترے ہاتھ لگا کون سکے گا

ولہ

جب تجھ عرق کے وصف میں جاری قلم ہوا — عالم میں اُس کا ناؤ جواہر رقم ہوا
نقطہ پہ تیرے خال کے باندھا ہے جس نے دل — وہ دائرے میں عشق کے ثابت قدم ہوا

ولہ

خدا نے مُنہ پہ ترے باب حُسن باز کیا — قدِ بلند کو تیرے تمام ناز کیا

ولہ

تخت جس بے خانماں کا دشت ویرانی ہوا — سر اوپر اُس کے بگولا تاجِ سلطانی ہوا

ولہ

حُسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد — طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ
حاکمِ وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بدخو — دیو مختار ہوا ملکِ سلیمان میں آ
بسکہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں — درد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ

ولہ

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی و کیا مجازی کا
ہر زباں پر ہے مثل شانہ مدام — ذکر تجھ زلف کی درازی کا

ولہ

دل صد پارہ تجھ پلک سوں بندھا — خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا

ولہ

آیا ہے نقل لینے ترے منہ کی تاب کی — تار خطوط سیتی بنا مسطر آفتاب کی

ولہ

بجا ہے گر شہیدِ سرو قد کو — بنا دیں چوب سے طوبےٰ کی تابوت

نکلا ہے بے حجاب ہو بازار کی طرف	ولہ	ہر بوالہوس کی گرم ہوئی ہے دکان آج
کیا ہے دفع مرے دردِ سر کو رونے نے	ولہ	ہوا ہے حق میں مرے خون دیدہ صندلِ سرخ
رحم سے بے جا ستم بہا بر ہے	ولہ	تو رقیباں اوپر کرم مت کر
جو آیا مست ساقی جام لے کر	ولہ	گیا یکبارگی آرام لے کر
میں اُس کو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ		جو کوئی آتا ہے تیرا نام لے کر
میں نہ جانا تھا کہ تو نادان ہے	ولہ	دل دیا تھا تجھ کو دانا بوجھ کر
ہوں گرچہ خاکسار رہے [illegible] ادب	ولہ	دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
لبِ دلبر پہ جلوہ گر ہے خال	ولہ	حوضِ کوثر پہ جوں کھڑا ہو بلال
صنم کے لعلِ لب وقتِ تکلم	ولہ	رگِ یاقوت ہے موجِ تبسم
نہ جا آنکھوں میں آ بہ دل میں اے شوخ	ولہ	کہ ہے خلوت میں اُس کی خوفِ مردم
تک ولی کو صنم گلے سے لگا	ولہ	تجھ کو ہے بندہ پروری کی قسم
اُس کے دہنِ تنگ کی تعریف کو میں نے	ولہ	صنعت سے ولی دیدۂ عنقا پہ لکھا ہوں
خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر انشا کروں	ولہ	بے تکلف صفحۂ کاغذ یدِ بیضا کروں
کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سروِ عریاں کے حضور		خود بخود رسوا ہے اُس کو اور کیا رسوا کروں
سر کروں جب وصف تیرے جامۂ گل رنگ کا		جامہ زیبوں کو بہ رنگِ جامۂ زیبا کروں
رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب		زیبِ لب ذکرِ سُبحٰانَ الَّذِی اَسرٰی کروں
آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کی ولی		سروِ قد کو دیکھ سیرِ عالمِ بالا کروں
یک بار اگر بات مری گوش کرے تو	ولہ	ملنے کو رقیبوں کے فراموش کرے تو
غیرت سے کرے چاکِ گریباں گُلِ پُرخوں		گر گُل کی حمائل کو ہم آغوش کرے تو
اے جانِ ولی وعدۂ دیدار کو اپنے		ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو
ایسے نصیب میرے کہاں ہیں ولی کہ آج	ولہ	اُس گل بدن کو اپنے گلے ہار کر رکھوں

خوش قد اس دل کو بند کرتے ہیں	ولہ	نام اپنا بلند کرتے ہیں
اے سلونی تو دیکھ مری ساحری کے تئیں	ولہ	شیشے میں دل کو بند کیا ہوں پری کے تئیں
صحبت غیر میں جایا نہ کرو	ولہ	دردمندوں کو کڑھایا نہ کرو
اک دل نہیں آرزو سے خالی	ولہ	بر جا ہے محال اگر خلا ہے
کیونکہ کپڑے رنگوں میں تجھ غم سے	ولہ	عاشقی میں لباس ہوتا ہے
رہیں گے خاک ہو تیری گلی میں	ولہ	وفاداری ہماری اس قدر ہے
دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن	ولہ	باعثِ خمیازۂ آغوش ہے
اب خلاصی عشق سے ممکن نہیں		دامِ دل زلفِ دوامی پوش ہے
نشہ بخش عاشقاں وہ ساقیِ گلفام ہے	ولہ	جس کی انکھوں کا تصور بیخودی کا جام ہے
مفلسی سب بہار کھوتی ہے	ولہ	عشق کا اعتبار کھوتی ہے
ترا منہ مشرقِ حسن انوری جلوہ جمالی ہے	ولہ	لبیں جامی جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے
مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے	ولہ	چمنِ حسنِ پریرو کا تماشائی ہے
گل رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندر طالع		جلوہ گر بریں ترے جامۂ دارائی ہے
شیخ مت گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور		گول دستار ترا باعثِ رسوائی ہے
اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق		کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے
دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے	ولہ	زخمی ہو شکار کیونکہ جاوے
چھوڑا ہے شوخ طرزِ خودکامی	ولہ	مت ہو سر دیدہ باز کا دامی
جب تک نہ ملے شرابِ دیدار	ولہ	انکھوں کا خمار کیونکہ جاوے
تجھ لب و زلف کے تماشے کو	ولہ	چل کہ آتے ہیں مصری و شامی

۲ — ولی

ولی تخلص، میرزا محمد ولی نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، بھتیجے ہیں شاہ اسرار اللہ صاحب ارشاد کے، علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے احوال اُس خجستہ کردار کا کہ جوانِ آزاد حال اور دوست ہے اس خاکسار کا، سنہ ۱۱۹۴ گیارہ سو چورانوے ہجری میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر جائے قرار رکھتے تھے، اور بیشتر شغل اشعار، زبان ریختہ میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے، اور دیوان بھی ان کا منتظم ہوا ہے۔ یہ منتخب افکار اُس ستودہ اطوار کا ہے ٭

نشۂ مے سے مرا پژمردہ دل گلشن ہوا
یہ چراغِ مردہ فیضِ آب سے روشن ہوا

وله
دل ہے تجھے منظور رہو اُس کا اگر دیکھنا
جان سے دھو ہاتھ کو تب تو ادھر دیکھنا
زلف کو ہے کھولتا اپنے وہ منہ پر ولی
ملتی ہے آپس میں اب شام و سحر دیکھنا

وله
آہ کا اُس کو کچھ اثر نہ ہوا
میرے اِس نخل میں ثمر نہ ہوا

وله
بےکسی پر مری کہے کوئی
تجھ بن اے نالہ نوحہ گر نہ ہوا

وله
صحبتِ نیکاں کرے دل میں بدوں کے کیا اثر
قند کب شیریں کرے ہوئے اگر بادام تلخ
کیا تمنا اُس شکر لب سے تو رکھتا ہے ولی
ہوگیا فرہاد کا شیریں سے آخر کام تلخ

وله
تھی آشنا نہ تیغ سے اُس کی کمر ہنوز
ہم تب سے ہاتھ پہ لئے پھرتے ہیں سر ہنوز
آنکھیں بھی انتظار میں پتھرائیں ولی
قاصد پر اُس صنم کی نہ لایا خبر ہنوز

وله
میری زبان تر سے نہ ہو تازہ کام خشک
کب سیر آب تیغ سے ہووے نیام خشک

وله
کبھی جو زلف اُٹھاوے تو منہ نظر آوے
اسی اُمید میں گذری ہے صبح و شام ہمیں

وله
زندگی کی اُس نے کچھ لذّت ولی جانی نہیں
جس کے دل میں دردِ عشقِ دلبرِ جانی نہیں

وله
چاہے کیونکر کہ یہ جی تن سے نکل جانے کو
پھر نہ آیا جو گیا اُس کی خبر لانے کو

وله
عیاں گر کروں دل کے سوزِ نہاں کو
لگے آگ جل شمع میری زباں کو

کبھی درد کی چاشنی کو نہ بھولے		ہما کھاوے میرے اگر استخواں کو
حد سے زیادہ رشتۂ الفت ہی مختصر	ولہ	ایسا نہ ہو کہ اس میں پڑے اب جدا گرہ
ہجر کی مارے ہی ڈالے ہے شبِ تار مجھے	ولہ	کب دکھاوے گا خدا صبح رخِ یار مجھے
دانۂ خال دکھا کر کیا تو نے صیاد		زلف کے دام میں آخر کو گرفتار مجھے
جس جگہ عشق رخش تاختہ ہے	ولہ	وہاں رستم حواس باختہ ہے
نگہِ گرم سے پری رو کے		شیشۂ دل مرا گداختہ ہے
جو اس لعل میگوں سے مدہوش ہووے	ولہ	اسے ہر دو عالم فراموش ہووے
بندِ قبا چمن میں جو وہ یار وا کرے	ولہ	لے برگ گل کو ہاتھ میں پنکھا صبا کرے

باب الہاء

۱-ہدایت

ہدایت تخلص۔ شیخ ہدایت نام اس مرد کا ہے۔ شاہجہان آبادی۔ معتقد اور شاگرد خواجہ میر درد کا ہے۔ ایک مثنوی انہوں نے بنارس کی تعریف میں بہت خوب لکھی ہے۔ اور داد مضمون تراشی کی دی ہے۔ شاعر فصیح بیان ہے، اور ناظم شیریں زبان۔ دیوان مختصر زبان ریختہ میں طبع زاد سے اس کے ہے، اور گم شدگانِ راہِ معنی کو خبر ہدایت اس کہن استاد سے ہے۔ یہ منتخب کلام اس شاعر بلند مقام کا ہے +

جب لوں ہوں ترا نام ٹپک پڑتا ہے آنسو		جس طرح کہ سمرن کا ڈھلک جاتا ہے منکا
جسے کہ زلف سیہ نے تری ڈسا ہوگا	ولہ	غرض وہ مر ہی گیا ہوگا کیا جیا ہوگا
جوں غنچہ ترے وصف میں ہوں سر بہ گریباں	ولہ	ہے منہ میں زباں پر نہیں مقدورِ سخن کا
نہ رحم اس کے ہے جی میں نہ دل میں ہیچ صنم	ولہ	ہماری گذرے گی کیونکر الٰہی کیا ہوگا
ہو گیا ہوں میں زرد جوں خورشید	ولہ	تھا ہرا وقت ہے اخیر مرا
تمام صبر و دل و دیں تو یار لوٹ گیا	ولہ	نہ خلفِ وعدہ کیا پر ترا نہ جھوٹ گیا

بلاہی زود ہے اس دخترِ رز کا ہی ساقی　　خمار جس کا مرے ہاتھ پاؤں کوٹ گیا
ملا ہے جا کے یہ آخر کو سادہ رویوں سے　　اگرچہ آئینہ تھا دل یہ ہم سے پھوٹ گیا
ہے آدمی کو بھی قیدِ حیات اک زنداں　　کسی نے خوب کہا ہے موا سو چھوٹ گیا
وله
آتش سے داغِ دل کی سراپا میں جل گیا　　گلزار ہو رہے کیا کہ بدن سارا پھل گیا
رو دے ہے کیا جوانی پہ اپنی کہ بے خبر　　شب کیا گذر گئی ہے کہ اب دن بھی ڈھل گیا
لب پر نہ حرفِ شکایت کا تھا ہجوم　　مکھڑے کے دیکھتے ہی یہ کچھ دل بہل گیا
وله
ہر لختِ دل سے گلے کا مرے ہار ہو گیا　　گل تھا پر اپنی چشم میں یہ خار ہو گیا
ہے کس کے جی میں خواہشِ سیرِ چمن یہاں　　سینہ تمام داغوں سے گلزار ہو گیا
آیا ہوں تنگ کشمکشِ دامِ زلف میں　　یارو میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا
بوسہ طلب کیا تھا فقط اور کچھ نہیں　　میں اتنی بات کہتے گنہگار ہو گیا
کچھ ان دنوں ہے حال ہدایت ترا تباہ　　کیوں میری جان کیا تجھے آزار ہو گیا
وله
عالم کو تیری چشم نے بیہوش کر دیا　　جس کی طرف نظر گئی مدہوش کر دیا
جاتا رہا ہوں آپ بھی میں اپنی یاد سے　　کیا جانئے کہ کس نے فراموش کر دیا
مجلس میں اس کی رات ہدایت نے سوزِ دل　　یہاں تک کہا کہ شمع کو خاموش کر دیا
وله
نے جم رہا جہاں میں نہ یہ جام رہ گیا　　مردوں کا اس جگہ میں مگر نام رہ گیا
کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک　　پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا
دیکھا جو تیرے چشم و دہن کو تو شرم سے　　منہ اپنا لے کے پستہ و بادام رہ گیا
آتی ہے آج تجھ سے تو کچھ اور بوئے نسیم　　رات اس چمن میں کون گل اندام رہ گیا
کیا دن تھے وہ بھی آہ ہدایت کہ جن دنوں　　راتوں کو اپنے پاس وہ گل فام رہ گیا
مدت ہوئی ہے اب تو ملاقات بھی نہیں　　آنے سے بلکہ نامہ و پیغام رہ گیا
وله
اک دن بھی مہربان نہ وہ بے وفا ہوا　　اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا

ہر ایک دانۂ انگور یہاں شراب ہوا
ولہ
وسلے یہ آبلہ اپنا نہ کامیاب ہوا

نہ صحن باغ میں لگتا ہے جی نہ صحرا میں
ہوا ہوں آہ میں یارب کس انجمن سے جدا

ولہ
دیکھ اس کی چشم مست کو دل تو بہک گیا
بس میری جان دو ہی پیالوں میں چھلک گیا

دیکھا نہیں ہے ہم نے ہدایت کو ان دنوں
شاید کسی جگہ پہ دل اس کا اٹک گیا

ولہ
عشق میں خوباں کے ہے طرز ستمگاری بہت
آہ دلداری ہے کم یہاں دل آزاری بہت

مار ڈالا ہند کے کافرادائوں نے ہمیں
حسن میں ان کے نمک اور طرحداری ہے بہت

ولہ
نہ ملے کارواں سے ہم اے وائے
گرچہ کہتا جرس پکار رہا

ولہ
یار ہے ہم میں ہدایت جلوہ گر
جس طرح ہو گوہر یکتا میں آب

پر نہیں معلوم ہرگز آپ کو
آب میں دریا ہے یا دریا میں آب

ولہ
تیری زلفوں کی کچھ چلی تھی بات
روتے روتے ہی گذری ساری رات

ولہ
دل تو سمجھائے سمجھتا ہے کبھو
پر ہدایت چشم تر کا کیا علاج

ولہ
کٹتی ہی نہیں یہ ہجر کی شب
یارب کیا آج سو گئی صبح

ولہ
تو نے گر قتل کیا ہم کو صنم خوب کیا
ہاں میاں سچ ہے کہ ایسے ہی گنہگار تھے ہم

قیس یوں مر گیا فرہاد کی وہ شکل ہوئی
آہ اس کوہ و بیاباں میں کئی یار تھے ہم

ولہ
تم نہ فریاد کسی کی نہ فغاں سنتے ہو
اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو

ولہ
عصا لے ہاتھ آئی سن تجھے گلشن میں آئی ہے
یہ نرگس باوجود اس کے کہ ہے معذور آنکھوں سے

ولہ
چولی مسک رہی ہے اور آنکھیں ہیں رسمسی
سچ کہیو ہم سے رات پیاری کہاں رہی

کرتا نہیں ہے جانے کو دل کوئے یار سے
گو اس میں جی رہے نہ رہے ہم تو یہاں رہے

ولہ
کیا خاک کو مری کہیں گلشن میں جا نہ تھی
پر چشم تجھ سے ملائے مجھے یہ صبا نہ تھی

سیر چمن ہوا دے و صحبت ولے ستم
ایسی گئی کہ ہم سے گویا آشنا نہ تھی

گلشن دوستی کے میں دیکھا چمن چمن
جز بوئے خون دل کہیں بوئے وفا نہ تھی

ضعف سے بیٹھا ہیں جوں نقش قدم تو کیا ہوا — ولہ — گردباد آسا مری طینت میں ہے آوارگی

ہوتے جب صد عیش و عشرت ہم کو تیرا دیکھنے — ولہ — دل گئے جس دن لگے تیرے اُسی دن عید ہے

دل مرا کیوں کر ہو غافل گور سے — ولہ — گھر نظر آتا ہے اپنا دور سے
آنکھ سے آنسو کبھو تھمتا نہیں — چشم بھی کیا کم ہے یہ ناسور سے
دل نہ کر تو شکوۂ جور بتاں — فائدہ کیا یار اس مذکور سے

گر نت یہی جور اور جفا ہے — ولہ — بنسے کا بھی اے بتاں خدا ہے
غرض یہی ہے مجھے اشک کے بہانے سے — کہ مہرباں ہو وہ یا اب کسی بہانے سے
برنگِ اشک اُسے آبرو ہے دنیا میں — جو اپنے گھر میں ہی محفوظ آب و دانے سے
وہ کیا کرے کہ محبت کا اقتضا ہے یہی — وگرنہ فائدہ اُس کو مرے ستانے سے
کہیں جو مہر و وفا ہو جہاں میں یا اخلاص — الٰہی اُٹھ گئی یہ رسم کیا زمانے سے
میں چھوڑتا ہوں کوئی اُس کو مثل حلقۂ در — یہ سر لگا ہے مرا اس کے آستانے سے

آنکھوں نے تری جس کے تئیں مست کیا ہے — ولہ — وہ شور قیامت ستی ہشیار نہ ہووے
آتا ہے مجھے رحم ترے حال پہ زاہد — اے وائے اُس اوپر کہ جو مے خوار نہ ہووے

کیا کہوں تجھ سے ہدایت کہ مری شام و سحر — ولہ — یاد میں زلف و رخ یار کے کیونکر گذری
دن گذرتا ہے مجھے روز قیامت سے دراز — رات گذری تو شب مرگ سے بدتر گذری

پختہ مغزانِ جنوں کے ہے کسی کو جنگ سے — ولہ — جو ثمر پکا سو پامالِ جفائے سنگ ہے
عشق نے تیری مجھے یاں تک کیا ہے ناتواں — تا بہ لب آنا نفس کو راہ صد فرسنگ ہے
ان دنوں کچھ تو ہدایت ہو گیا ہے زرد سا — ظاہرا عاشق کسی پہ ہے ترا کیا رنگ ہے

صدقے ترے گلعذار جی سے — ولہ — اک جی سے ہیں کیا ہزار جی سے
کھٹکے ہے تری مژہ ہر اک وقت — نکلا نہ کبھو یہ خار جی سے

گھر سے نکلے ہی تو جی ساتھ نکل جاتا ہے — ولہ — کوئی قامت ہے کہ یہ آہ دل محزوں ہے

زلفِ کج منہ اوپر جو چھوڑی ہے — کیا یہ صید ہے نکلتا تھوڑی ہے

چشمۂ خوں سے ہے دامن دریا — آستیں کس نے یاں نچوڑی ہے

شاخ گل خم نہیں کسو نے کیا — ہاتھ معشوق کے مروڑی ہے

عمر کوتاہ کارِ عمر دراز — ساتھ کے بہت رات تھوڑی ہے

وله

ایک وہ ماہ رو غائب ہے نظر سے منہ — وہی تارے ہیں وہی ماہ وہی گردوں ہے

وله

ہے خوب سیر کی جگہ میں ہر ایک بستی کی — بنا خراب ہو بنیاد بت پرستی کی

ہمیں نشیب و فرازِ زمانہ سے کیا کام — جو سربلند ہیں ان کو ہر فلک پستی کی

وله

جی تو گلشن میں بھی نہیں لگتا — کس کی مجلس سے ہم اداس گئے

جب سنا میں نے غم ہدایت کا — سنتے ہی بس مرے حواس گئے

جاؤں نکل میں دشت میں یا شہر میں پھروں — کوئی ایسی شکل ہو دے کہ ٹک جی بہل سکے

وله

شہید تیغ ابرو ہی اسیر دام گیسو ہے — ہدایت بھی تو کوئی زور ہی شہد شکستہ ہے

رباعی

ثابت کوئی اپنے جسم و جاں سے نہ پھرا — یک شخص ہزار کشتگاں سے نہ پھرا

کوچہ تو ترا رہ عدم سے نہیں کم — جو کوئی گیا سو پھر وہاں سے نہ پھرا

رباعی

دلِ عہد شباب ہو چکا ہے باقی — پیری ہے سو اس میں کیا رہا ہے باقی

ہوتا ہے کوئی دم میں یہ دور لب آخر — شب گذری ہے صرف رہ گیا ہے باقی

باب الیاء

یقین

یقین تخلص، انعام اللہ خاں نام شاہجہان آبادی بیٹا اظہر الدین خاں، اور نواسا شیخ مجدد الف ثانی کا تھا شاگرد میرزا مظہر جان جاناں کا مشہور اور منظورِ نظر مرزائے مذکور۔ اکثر یہ گمان باشندگان شاہجہان آباد کو تھا، کہ یقین فنِ شعر و شاعری میں محض بے استعداد تھا۔ مرزا مظہر خود شعر کہتے تھے، اور نام اس کا داخل اشعار

کرتے تھے۔ مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے، کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اس کو قتل کیا، اور نعش کی اس کو دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اُس عملِ شنیع کا گذرا تھا۔ اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں یقین سے اس مقدمہ میں باپ کو اکثر متنبہ کیا۔ ایک دن اُس نے خفا ہو کر اس بیچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا بدرستی خدا کو ہے، اہلِ یقین گمانوں کا بالکنہ اس خالق ارض و سما کو ہے۔ بہر حال یقین مذکور کا کلام طبائع کے مرغوب ہے، اور اشعار اس کے جاں خراش و دل کوب۔ یہ ابیات آبدار اُس کا خلاصہ افکار ہیں ؛

نہ مرتا میں اگر صدقے ترے جاں کی کام آتا
اگر سنہ ناز کا تھا گالیاں کھانے کے کام آتا

ولہ
میں تو ظاہر نہ کروں اُس کی جفا کو لیکن
چھپ سکے کیونکہ یقین زخم نمایاں میرا

ولہ
مجھے گر حق تعالیٰ کا فرسا ملئے جہاں کرتا
بتوں کو میں بندہ ان بیکسوں پہ مہرباں کرتا

نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصرِ شیریں میں
جو میں ہوتا بجائے شیر جوئے خوں رواں کرتا

اگر مر کر نہ میں اُس شوخ کی خاطر نشاں ہوتا
خدا جانے وفا میرے کے حق میں کیا گماں کرتا

زباں فولاد کی ہو تب جوابِ کوہکن دیوے
ستم ہوتا اگر پرویز کو عشق امتحاں کرتا

ولہ
نہیں معلوم اب کے سال میخانے پہ کیا گذرا
ہماری توبہ کرنے سیتی پیمانے پہ کیا گذرا

برہمن اپنے سر کو پیٹتا تھا دیر کے آگے
خدا جانے مری صورت سے بتخانے پہ کیا گذرا

یقین کب میرے سوزِ دل کی داد کو پہنچو
کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانے پہ کیا گذرا

ولہ
ہیں زخم میرے کاری اس سینے سے کیا ہو گا
اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سے کیا ہو گا

ولہ
اگر تجھ کو زلیخا دیکھتی سب کچھ بسر جاتی
تماشا ماہِ کنعانی کا اُس کو خواب ہو جاتا

ولہ
سر سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن سے نظارہ سے باز آیا
یقیں پرہیز اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا

ولہ
تنگ دل کو کب بھلی لگتی ہے بستاں کی ہوا
باغ سے یوسف کو زنگیں تر ہے زنداں کی ہوا

ولہ

نہ آب تیشہ فرہاد اپنے خوں میں گرلا سکتا — تو ایسے رنگ سے کب نقش شیریں کو بنا سکتا

یہ عشق سر شکن فرہاد پر لایا جو کچھ لایا — مگر نہ کوہکن ایسی فتح خسرو کو دلا سکتا

ولہ

تجھ آنکھوں سے اتر کر دل نہ کرتا شور کیا کرتا — یہ شیشہ طاق سے گرتا نہ ہوتا چور کیا کرتا

ولہ

یہ دل ایسا خراب کوچہ و بازار کیوں ہوتا — اگر ملتا نہ اتنا گل رخوں سے خوار کیوں ہوتا

تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھ ورنہ — یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

یقین امید جینے کی نہیں تیری ان آنکھوں سے — اگر پرہیز تو کرتا تو یوں بیمار کیوں ہوتا

ولہ

گرا میں آنکھ سے تیری جہاں کے ہاتھ کیا آیا — مجھے پٹکا زمین پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا

نہ کہتی راز دل تو اتنی رسوائی بھلا سہتی — غنیمت کر کے مجھ کو اس زباں کے ہاتھ کیا آیا

ولہ

کیا بدن ہو گا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند — برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

ولہ

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک — دیکھا سوا اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

ولہ

اس قدر غرق لہو میں یہ دل زار نہ تھا — جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا

حسن کا عشق زلیخا سیتی کچھ چل نہ سکا — ورنہ وہ پاک گہر قابل بازار نہ تھا

دل مرا عشق کے دھڑکوں سے ہوا جاتا ہے — یہ وہ دل ہے کہ کوئی ایسا جگر دار نہ تھا

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس — کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

ولہ

اتنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا — ملنے میں تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

ناصح جو یہ نصیحت بیجا ہے میں سنی — معذور رکھیو مجھ کو مرا دل بجا نہ تھا

ولہ

خفیف مجھ سے الجھ کر عبث ہوا واعظ — کہ میں تو مست تھا اس کو بھی کیا شعور نہ تھا

ولہ

تری آنکھوں کی کیفیت کو مے خانے سے کیا نسبت — نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سے کیا نسبت

ولہ

بتاں کی مجھ سی خاطر جمع ہے یہاں تک کہ کہتے ہیں — کہاں اس دام سے یہ صید جا سکتا ہے کیا ہمت

ہمارا شور سن مجنوں کو بھولی طرز نالے کی — کوئی شیر دل کے منہ پر بجا سکتا ہے کیا قدرت

ولہ

شیشہ دل کے تئیں اپنے سنبھالے رکھتے ہیں — پھر کرے گا کون اس کے پھوٹ جانے کا علاج

سو جگہ سے دل گریباں پھاڑ دیوانے کی طرح

وله

زلف کی زنجیر میں آخر پھنسا شانے کی طرح

جی نکل جاتا ہے پھیرا جب کبھو آتی ہے یاں
وہ قسم کھا کر اسی ساعت کہ جانے کی طرح

خار سے مژگاں کی بھی تر تک ہے میرا بے طرح

وله

رکھ مری آنکھوں پہ دیتے ہو کف پا بے طرح

فصل گل بھی آن پہنچی دیکھیے کیا ہو یقیں
اب کے چلتا ہے جنوں پر دل ہمارا بے طرح

گرم ہے شیریں سخن کے ہے وجد میں آنے کا شور

وله

پر قیامت بانگ ہوتا ہے مؤذن کا شور

آہ و نالہ پہ نہیں موقوف شہرت عشق کی
کس قدر ہے اس خموشی ساتھ پروانے کا شور

دل ہمیں کہہ کر چلا تھا اپنے جانے کی خبر

وله

پھر نہ دی ہم کو کسی نے اس دیوانے کی خبر

بلبلیں سہمی چلی جاتی ہیں باغوں کی طرف
کچھ تو اڑتی سی سنی ہے گل کے آنے کی خبر

نیں پہنچا ضعف سے نالہ ہمارا تا فلک
کون لے اس ناتواں کی اب دوا دینے کی خبر

توقع دے کے مت کہ ناامیدی کی سخن بس کر

وله

جواب تلخ مت دے مجھ کو اے شیریں دہن بس کر

جو لوہا جس نہ دی اس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل
بہت کی تو نے اس تیشہ کی خدمت کوہکن بس کر

خال گورے منہ کا لیتا ہے مرے دل کو چرا
اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پھرتے ہیں چور

گریباں پھاڑتے ہیں دیکھ خوبان چمن کیونکر

وله

نہ کیجے چاک ناصح اس ہوا میں پیرہن کیونکر

کوئی محنت کوئی لذت اٹھا دے یاد سے کوئی
کہو اپنے تئیں ضائع نہ کرتا کوہکن کیونکر

تعجب سخت رہتا ہے یقیں اس بات کا مجھ کو
کہ اتنا بولتے ہیں تلخ یہ شیریں دہن کیونکر

بعد مرنے کے ہوں میں گور میں غمناک ہنوز

وله

گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز

منہ پہ کھاتا ہے اسی طرح سے تلوار کہ بس

وله

دل مرا عشق میں ایسا ہے جگردار کہ بس

نزع میں دیکھ کے مجھے یار جھجک کر بولا
کیا بری طرح سے مرتا ہے یہ بیمار کہ بس

آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا
کیا خریدار یہ پایا ہے خریدار کہ بس

آپ سے ہم نے مقرر کی ہے اپنی جا قفس

وله

ورنہ ٹک پھڑکیں تو ہو جاوے تہ و بالا قفس

تنگ تو کرتا ہے پر ہم جو کہیں جاتے رہیں
تو پڑا منہ دیکھتا رہ جائے گا تنہا قفس

آج دیکھی ہے میں وہ لطف کی بیداد کہ بس
جی میں آتا ہے تری جیب کو کر دکھا دیجے آ سے
کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی جب چھوٹے
تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دیوانہ ہوتا
عاقبت تن پروری ہوتی ہے گردن کا وبال
اہلِ نود آہن دلوں کو دیکھ شرماتے ہیں سخت
یہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینہ کا داغ
ہم تو مرتے ہیں گے اور بجھتا ہے الفت کا چراغ
خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقین
تا مع سے مجھ کو غم نے کیا شرمسار حیف
دل نہیں کھنچتا ہے بن تیرے بیاباں کی طرف
اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جامِ شراب
سم کے ڈوبے جو سنتی تھے سو یہ دیکھے یقین
آئینہ ہوتا ہے اُس روئے درخشاں کا حریف
بہت جینے کی تدبیر اہل عرفاں کو نہیں لائق
رشک سے لاگے ہے پروانے کے جیسی تن کو آگ
جلتے تبوں سے کل ان تیلیا کپڑوں کے ساتھ
چمن میں مجھ سے دیوانے کو لے جانیکا کیا حاصل
جنھیں بالوں کی پھانسی دی ہے دی ہرگز نہیں جیسے
ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہے تو دارو ہے
ہم نہ کہتے تھے کہ مت چھیڑ ان ڈونوں معادوں کے تئیں

سر پہ آیا مرے اس طور سے جلاد کہ بس
باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس
ہم ہوئے ایسے بری وقت میں آزاد کہ بس
آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس
ولہ
کس قدر پہلوی چرب اپنے سے دُکھ پاتی ہے شمع
دیکھ کر گل گیر کی صورت کو ڈر جاتی ہے شمع
ولہ
ہو گیا ناسور آخر یارِ دیرینہ کا داغ
ولہ
دیکھیے پھر ہووے کب روشن محبت کا چراغ
ہے مرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ
ولہ
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف
خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف
دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہے باراں کی طرف
دل کھنچا جاتا ہے اُس زلفِ پریشاں کی طرف
ماہ بن اور کون ہو خورشیدِ تاباں کی طرف
ولہ
کہ پینا آبِ حیواں شانِ انساں کو نہیں لائق
ولہ
لگ گئی ہے فانوس ایسی تیرے پیراہن کو آگ
جی دھڑکتا ہے مبادا لگ اُٹھے دامن کو آگ
ولہ
دکھا کر گل جنوں کو شور پہ لانے کا کیا حاصل
جو زلفوں میں پھنسا دل اُس کے غم کھانے کا کیا حاصل
یہ سب کچھ سن کر ساقی بات پی جانے کا کیا حاصل
ولہ
خط کی صورت میں پڑا آخر نہ آہوں کا وبال

اس تغافل ساتھ میرے سامنے سے درگذر — سے طرح پڑتا ہی حسرت کی نگاہوں کا وبال
ہاتھ لگتا گر زبانِ مصر کو یہ آفتاب — وله — خواب ہو جاتا انہیں اس راہ کنعان کا خیال
مے ہوئی آخر رہی تدبیر غم کی ناتمام — وله — کس سے دل خالی کریں اب ہم چکا ملنا تمام
تیری آنکھوں میں نشہ نے اس طرح ملا ہی جوش — وله — تو اتے ہیں جس طرح بدست مے خانے میں دھوم
کروں کیونکر میں قید زلف سے چھٹنے کی تدبیریں — وله — پڑیں ہیں میرے ہر انگشت میں جوں شانہ زنجیریں
ہمیں بھی بات کہ آتی ہی لیکن دل نہیں حاضر — حیلے سے دور ہی ناصح خموشی ساتھ تقریریں
یقیں اقبال ہاتھ آیا نہیں کچھ جی کے جانے سے — نہیں ہووے گی ہم فرہاد کو سو بار سر چیریں
چمن میں شاخ ہل جاتی ہی جیسے گل کے ہلنے سے — وله — لچک جاتا ہی دم لیتے نزاکت اس کو کہتے ہیں
زخم بن مجھ کو کچھ اس لاگ سے مقصود نہیں — وله — عشق پھیکا ہی اگر داغ نمک سود نہیں
ہے اسی تیغ کے زنگار کا مرہم درکار — اور کسی طرح مرے زخم کا بہبود نہیں
کرتا ہی کوئی یار و اس وقت میں تدبیریں — وله — مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں
ناداں ہی جو معنی چھوڑ صورت کی طرف جاوے — لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہیں تصویریں
چہرے سے نکل کر مو لپٹے ہیں یقیں منہ پر — اوراق طلائی پر جوں کھینچی ہیں تحریریں
کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں — وله — عبث سیتے ہو اس کو کیا رہا ہی اب گریباں میں
چمن کر بیچ کلیا نی ہے جیسے شاخ سنبل کی — ہوئے ہیں کس قدر دل جمع اس زلف پریشاں میں
بہار آتی ہی ہم کو کیا کہے گا باغباں دیکھیں — وله — چمن میں باندھنے پاویں گے اب کے آشیاں دیکھیں
اٹھا اس منہ سے اے باد صبا گھونگھٹ کی آنچل کو — توجہ سے تری ہم بھی ٹک اک یہ گلستاں دیکھیں
نہ کر خجل مجھے میں حال مرا نہ ہوا سے عشق — وله — کہ میری آنکھ میں آنسو جگر میں آہ نہیں
تو نے ہم پر جو جفا کی ہے سو وہ کو نہیں — وله — بس یہ ہم نے جو وفا کی ہے سو منظور نہیں
سینہ میرے میں تری عشق سے جو شاں ہی عمل — کون ناسور ہے جو نیش کا معمور نہیں
دین و دنیا کی مجھے کام سے کھوتا ہے یقیں — چھوڑوں عشق نہ باللہ کہ مقدور نہیں

ولہ خدا کی بندگی کیجئے اُسے یا عشق معشوقی — وہ نسبت ایک سے سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں

سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے — بیگانگی سے اُس کی کوئی آشنا نہیں

شیریں دہن بھی تلخ لگے بولنے یقیں — اب چھوڑ دے نظارہ کچھ اس میں مزا نہیں

ولہ وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں — اُس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں

ترے سفر کی خبر سُن کے جان دھڑکوں سے — جو پہنچوں مرنے کے نزدیک میں تو دور نہیں

کوئی بھی دیتا ہے لڑکوں کے ہاتھ شیشۂ دل — یقیں میں خود سے دیکھا تو کچھ شعور نہیں

ولہ جس محبت میں نہیں ہے شور ہے وہ بے نمک — کیا مزا ہے عشق کرنے میں جو رسوائی نہیں

بن یقیں کے باغ میں جا کر بتاں کہتے ہیں سب — سیرِ گل سے جی نہیں لگتا وہ سودائی نہیں

ولہ شکوہ جفا کا یار سے کرنا وفا نہیں — بندہ کو اعتراض خدا پر روا نہیں

ولہ اگر ستم ہو عاشق دم نہ مارے یار کے آگے — کہ اُس کا جی نکل جاتا ہے اُس کی ایک تکن میں

ولہ گالی بھی پی گئے ہیں ماریں بھی کھائیاں ہیں — کیا کیا تری جفائیں ہم نے اُٹھائیاں ہیں

ایسا دراز دامن میں ہاتھ اُن کے آیا — بختوں کی عاشقوں کے کیا نارسائیاں ہیں

حق کو یقیں کے آخر برباد مت دو یارو — تم نے سخن کی طرزیں اُس کی اُڑائیاں ہیں

ولہ قامتِ رعنا سے تیرے بس کہ شرماتا ہے سرو — دیکھ کر تجھ کو زمیں کے بیچ گڑ جاتا ہے سرو

تم ہمیں پامال یوں کرتے ہو اب خوش تھا تو — دیکھتے ہو قمریوں کو سر پہ بٹھلاتا ہے سرو

ولہ کھڑا ہے سرو نپٹ بن بنا کے رعنا ہو — جو یار پردے سے نکلے تو کیا تماشا ہو

نہ لاتا تھا مرے گریہ کو شور پر اے عشق — بڑی بلا تو نے چھیڑی ہے دیکھئے کیا ہو

ولہ خوفِ انصاف سے اتنا بھی زباں تر نہ کرو — لعل کو یار کے ہونٹوں سے برابر نہ کرو

باندھ کر مجھ پہ کمر لطف نہیں غیر کا قتل — اپنی بیداد کے مضموں کو مکرر نہ کرو

ولہ کوئی یہ چاند سا مُنہ چھوڑ کر عاشق ہو شعلہ کا — گذر آتش پرستی سے یہ پروانے سے کہہ دیکھو

ولہ ستاؤ مت یقیں کا دل کہ یہ خوباں کا مسکن ہے — خدا جانے کہ کیا ہو اس کے مر جانے کو مت چھیڑو

جفا کے عہد میں اسے ظالمو نہ دیر کرو
حنا کی طرح میں اپنا بہل کیا ہے خوں
خدا کرے کہ کہوں حق شتاب ثابت ہو
جو تو شراب پیے کیونکہ دل کباب نہ ہو
تنک گذرتے ہیں ایام عشق داغ بغیر
دیوانے شہر سے یہاں آکے جی چھپاتے ہیں
بتاں کی وجہ نہیں حسنِ خلق ودامنِ پاک
یقیں بتاں کا ہو جب بند جب ہو داغ
شہر میں تھا نہ ترے حسن کا سا شور کبھو
فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح
گو نہ کر وعدہ وفا دے مجھے اس کا تو جواب
اپنی بیداد کی سوگند ہے تجھ کو اے مرگ
خواب میں کس طرح دیکھوں تجھ کو بےخوابی کے ساتھ
مفت نہیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں یقیں
بہار آئی ہمیں کیا حکم ہے اے باغباں سچ کہہ
تنک ڈالا ہے مجھ میں اے جفا شوِ محبت نے
یقیں راتوں کو کر کر شور نیندیں سب کی کھوتا ہے
کچھ عمر نہیں باقی پیارے تو شتاب آجا
منہ اپنے کو گلشن میں سے نہ دکھایا کر تو
رودادِ محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے
عمر میں تو نے تو دیکھے ہیں بہت غم خانے

وله
مری زباں پہ شکایت پست دلیر کرو
بتاں شہید کرو خواہ دستگیر کرو
مت امتحانِ وفا میں یقیں کے دیر کرو

وله
لگے جب آگ کہاں تک یہ زہر تاب نہ ہو
کہ سرد ہووے ہوا جس دن آفتاب نہ ہو
خدا کرے یہ خرابہ کبھی خراب نہ ہو
وہ کیا مزا ہے جو معشوق بد شراب نہ ہو
جو ہووے کافر اسے کس طرح عذاب نہ ہو

وله
معرا اس جنس سے اتنا نہ تھا معمور کبھو
خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو
مجھ سے ملنا ہی سخن ہے تجھے منظور کبھو
تو نے دیکھا ہے یقیں سا کوئی رنجور کبھو

وله
صبح آسایش کہاں ہوتی ہے بیگانے کے ساتھ
کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کے ساتھ

وله
چمن میں رہنے پاوے گا ہمارا آشیاں سچ کہہ
کبھو کھائی ہیں تو نے اس مزے کی استخواں سچ کہہ
یہ کس سے درد سیکھا ہے فریاد و فغاں سچ کہہ

وله
ڈرتا ہوں چھلک جاوے لبریز ہے پیمانہ
یہ سبزہ ترے خط کا ہے سبزۂ بیگانہ
کچھ خوب نہیں سنتا افسوں ہے یہ افسانہ

وله
آتو اسے جنم تک اک اس دلِ ناشاد کو دیکھ

وله
کہاں تاثیر نالوں میں ہے اے مرغ سحر چپ رہ
عبث صیاد کو ناخوش ہے کیوں کرتا ہے بس چپ رہ

وله
جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے
بندگی سے جس نے خو کی ہو خدائی کیا کرے
وصل کی گرمی سے مجھ کو ضعف آتا ہے یقیں
دیکھئے مجھ ساتھ خوباں کی جدائی کیا کرے

وله
کیا دل ہو اگر جلوہ گہ یار نہ ہووے
ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے
دل جل جو گیا خوب ہوا سوختہ بہتر
وہ جنس کوئی جس کا خریدار نہ ہووے

وله
دوانے کس طرح نہ اٹھاویں ہاتھ طفلاں سے
کہ ہے کشت جنوں سیراب ان کو سنگ باراں سے

وله
یارب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے
کون اس کوچہ میں جز تیر گذر کرتا ہے
بنی حیرانی کی ہم عرض کریں کس منہ سے
کب وہ آئینہ پہ مغرور نظر کرتا ہے
عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا
نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا ہے

وله
جو سر پاؤں پہ رکھ دیجے تو خوش ہوویں میل ہم سے
ولیکن ہائے ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سے

وله
مرے آنسو بھی مارے ضعف کے اب چل نہیں سکتے
کیا اے عشق مجھ کو ہائے ایسا ناتواں تو نے

وله
خطا ہو مفت سر پر یار کیوں دیجے رقیباں کو
ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

وله
اگر دیتے ہو دل کی داد جتنا اس کا جی چاہے
تو کرنے دو اسے فریاد جتنا اس کا جی چاہے
نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جاویں چھوڑ بت خانہ
کرے واعظ ہمیں ارشاد جتنا اس کا جی چاہے

وله
نہیں کوئی کہ دشنام اس کی ہم تک یاد دلا دے
گیا ہے اب اس کو دیکھنے کب تک خدا لا دے
پہنچے تمام الٰہی اس محبت پر کہ ہوے کس
مرے فرہاد اور پرویز و شیریں کو اٹھا لا دے
دیا حسن میں تو خوش ہوا پر یہ پڑی مشکل
کہ لٹ جاتا ہے وہاں جو کاروان حسن وفا لا دے
مناسب نہیں ہے شکوہ ہو رکا ان خوب رویوں سے
یقیں کوئی بری باتوں کو اچھے منہ پہ کیا لا دے

وله
زمیں پر جس طرح گرتا ہے سایہ سرو رعنا کا
تری قامت کے آگے فرش ہو جاتی ہے رعنائی
نہیں ہوتے کبھو احباب کی خاطر ملول اس سے
خدا شاہد عجب یہ مصاحب ہے یہ تنہائی

وله
معاوضہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے
کبھو کسو سے کوئی کیونکر آشنا ہووے

اگرچہ غیبت ہیں یاد کر نہیں سکتا | کبھو بُرا ہی ہمیں کہ ترا بھلا ہووے
یقیں ہوا ہے مجھے قطرے سے اشک کے معلوم | نہ اُٹھ سکے کوئی جو آنکھ سے گرا ہووے

وله
خبر کیا پوچھتے مرغِ قفس سے آشیانے کی | اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی
گئے کچھ بھی شرح گلیں اور پرواز اول میں | نہ دی فرصت زمانے نے ہمیں ہوویں بجانے کی
سو جاتا ہوں مت آتا ہی کس کر باندھ بالوں کو | ٹک اک ڈھیل تو کر دے جان زنجیریں دوانے کی

وله
زنجیریں بالوں کے پھنس جانے کو کیا کہئے | کیا کیا کیا یہ دل نے دیوانے کو کیا کہئے
دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا | اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہئے

وله
دکھ تو دیتا ہے کروں تجھ کو بھی حیراں تو سہی | باغباں اب کے اجاڑے لوں گلستاں تو سہی

وله
منت کب آنہ کرتی ہے گرفتاری مجھے | جی ہی لے چھوڑے گی آخر کو یہ بیماری مجھے
کب ہوس ہے مجھ کو رسوائی کی لیکن کیا کروں | کھینچ کر لاتی ہے اس کوچہ میں ناچاری مجھے
کیا لگا لیتا ہے خوباں کو نقش کرتی ہی ولے | آئینہ کی سادہ لوحی ساتھ پرکاری ہے مجھے

وله
جس کو منظور ہو جینا اسے مرنا ہو عذاب | ہے دمِ پاک مسیحا دمِ شمشیر مجھے

وله
بے قراری کب ٹھہرنے دیوے مجھ کو زیر تیغ | مانا سیماب کا مشکل ہے قاتل کیا کرے

وله
ستم ہے قید کرنا اس طرح کے مرغ ناداں کو | کہ جو مارے بھلائی کے قفس کو آشیاں سمجھے

وله
کرتے ہیں اپنے بال و کھا مبتلا مجھے | اس پیچ سے بتاں کے نکالے خدا مجھے
جور و جفا میں یا رب بہت ہو گیا ہے سیر | کرتے تو کچھ پہ راست نہ آئی وفا مجھے

وله
خدا مجھے ترے داغوں سے لالہ زار کرے | یہ خارِ خشک مگر آگ سے بہار کرے
قیامت آپ پر اس قدر سر آ چکے ہم تو | کہاں تلک کوئی محشر کا انتظار کرے

وله
اس بہشتی پوش سے آغوش رنگیں کیجئے | جی میں ہے اک مصرعِ موزوں کو تضمین کیجئے
نگاہ گرم سے کھا دیتی تاب سو کس طرح | خدا کسی کے تئیں اتنا خوش کمر نہ کرے

وله
یہ دل ملوک ہے خوباں کا کون اس کو بچا رکھے | بغل میں کون مالِ بادشاہی کو دبا رکھے

مجھے مت پوچھ پیارے اپنا دشمن	وله	کوئی دشمن ہوا ہے اپنی جاں کا
میں روز و شب وصال سے تیرے ہوں کامیاب	وله	کیونکر کہوں کہ تجھ سے بہتر ہے آفتاب
سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے	وله	راستے ہیں تجھے دار کی صورت
مجھ کو معلوم یوں ہوا گل سے	وله	بھول جاتے ہیں اس سے دولتمند
کیوں بچے جو تم کہو دشمن ہمارے اس قدر	وله	دوست کا دشمن کوئی ہوتا ہی پیارے اس قدر
نگہباں چاہیئے سرشار کے پاس	وله	تری آنکھوں سے کیونکر دل جدا ہو
روٹھتا ہوں اس سبب ہر بار میں	وله	تا گلے تیرے لگوں اے یار میں
اس پری پیکر کو مت انسان بوجھ	وله	شک میں کیوں پڑتا ہے اے دل اے جان تو
کیا جانئے وصال ترا ہو کسے نصیب	وله	ہم تو ترے فراق میں اے یار مر چلے
رونقِ اسلام تیرے رو سے ہے	وله	کفر کا رشتہ ترے گیسو سے ہے
بے قراروں کے تئیں آرام دل		اے مرے پیارے ترے پہلو سے ہے
جدائی سے تری اے صندلی رنگ	وله	مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے
ہوا معلوم یہ غنچہ سے ہم کو	وله	جو کوئی زردار ہے سو تنگ دل ہے
نہیں چھوڑیں ہیں سدا زلف تری اپنی مروڑ	وله	باوجودیکہ کمال ان میں پریشانی ہے
اب تو سجن ہمیں کو تباہی تمہیں سے ہے	وله	ہم سب طرف سوں یار تمہاری گلے پڑے
یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط	وله	رکھتا ہے یہ دو نین کہو تو نظر کرے
زخمی برنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا	وله	گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہے زخمِ ستم شامیوں کے ہاتھ		دھو ہاتھ زندگی سیتی مہمانِ کربلا
اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ		ہے سر بریدہ شمعِ شبستانِ کربلا

بعون اللہ تعالیٰ کتاب تذکرۃ الشعرا من تالیف مرزا علی خاں لطف تخلص بتاریخ بست و ششم ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۳۵ ہجری روز جمعہ بعد سہ پاس روز گذشتہ باتمام رسید ❖

UNIVERSITY OF HYDERABAD
LIBRARY
HYDERABAD (A.P.)

1 Books / Journals should be returned on the due date

2. Borrowers are responsible for every book / journal taken by them and will be expected to pay for any book / journal damaged, defaced or lost.

Help to keep the book fresh and clean